گمان

جون ایلیا

انتساب

اس یقین کے نام

جو مجھے اپنے قارئین

کی شعر شناسی پر ہے

اشاریہ

غزلیات:۔

نظمیں:۔



فرقت میں وصلت برپا ہے' اللہ ھُو کے باڑے میں
آشوبِ وحدت برپا ہے' اللہ ھُو کے باڑے میں

روحِ کُل سے سب روحوں پر وصل کی حسرت طاری ہے
اک سرِّ حکمت برپا ہے' اللہ ھُو کے باڑے میں

بے احوالی کی حالت ہے شاید یا شاید کہ نہیں
پُر احوالیت برپا ہے' اللہ ھُو کے باڑے میں

مُختاری کے لب ''سِلو انا'' جبر عجب ترٹھہرا ہے
ہیجا ن غیرت بر پا ہے' اللہ ھُو کے باڑے میں

بابا الف ارشاد کناں ہیں پیشِ عدم کے باڑے میں
حیرتِ بے حیرت برپا ہے' اللہ ھُو کے باڑے میں

معنی ہیں لفظوں سے برہم '' قہرِ خموشیِ عالم'' ہے
ایک عجب حجّت برپا ہے' اللہ ھُو کے باڑے میں

موجودی سے انکاری ہے اپنی ضد میں نازِ وجود
حالت سی حالت برپا ہے' اللہ ھُو کے باڑے میں





کیا یقیں اور کیا گماں چُپ رہ
شام کا وقت ہے میاں، چُپ رہ

ہوگیا قصہ وجود تمام
ہے اب آغازِ داستاں، چُپ رہ

میں تُو پہلے ہی جا چکا ہو کہیں
تُو بھی جاناں نہیں یہاں، چُپ رہ

تُو اب آیا ہے حال میں اپنے
جب زمیں ہے نہ آسماں، چُپ رہ

تُو جہاں تھا جہاں جہاں تھا کبھی
تُو بھی اب تو نہیں وہاں، چُپ رہ

ذکر چھیڑا خدا کا پھر تُو نے
یاں ہے انساں بھی رائگاں، چُپ رہ

سارا سودا نکال دے سر سے
اب نہیں کوئی آستاں، چُپ رہ

اہرمن ہو، خدا ہو، یا آدم
ہو چکا سب کا امتحاں، چُپ رہ

درمیانی ہی اب سبھی کچھ ہے
تُو نہیں اپنے درمیا ں ' چُپ رہ

اب کوئی با ت تیری بات نہیں
نہیں تیری ' تری زباں ' چُپ رہ

ہے یہا ں ذکر حا لِ مو جو دہ
تُو ہے اب از گز شتگا ں ' چُپ رہ

ہجر کی جاں کنی تما م ہو ئی
دل ہوا جو ن بے اما ں ' چُپ رہ

☆☆☆☆

ایک گما ں کا حال ہے اور فقط گما ں میں ہے
کس نے عذابِ جاں سہاں' کون عذابِ جاں میں ہے

لمحہ بہ لمحہ دم بہ دم آن بہ آن رم بہ رم
میں بھی گزشتگا ں میں ہوں تُو بھی گزشتگا ں میں ہے

آدم و ذاتِ کبریا کرب میں ہیں جُدا جُدا
کیا کہوں ان کا ماجرا جو بھی ہے امتحاں میں ہے

شاخ سے اُڑ گیا پرند ہے دلِ شامِ دردمند
صحن میں ہے ملال سا حُزن سا سماں میں ہے

خود بھی بے اماں ہوں مَیں، تجھ میں بھی بے اماں ہوں مَیں
کون سہے گا اس کا غم وہ جو میری اماں میں ہے

کیسا حساب کیا حساب حالتِ حال ہے عذاب
زخم نفس نفس میں ہے زہر زماں زماں میں ہے

اس کا فراق بھی زیاں اس کا وصال بھی زیاں
ایک عجیب کشمکش حلقہ بے دلاں میں ہے

بود و نبود کا حساب میں نہیں جانتا مگر
سارے وجود کی ''نہیں'' میرے عدم کی ''ہاں'' میں ہے

☆☆☆☆

ہم تیرا ہجر منانے کے لیے نکلے ہیں
شہر میں آگ لگانے کے لیے نکلے ہیں

شہر کو چو میں کرو حشر بپا آج کہ ہم
اس کے وعدے کو بھلا نے کے لیے نکلے ہیں

ہم سے جو روٹھ گیا ہے وہ بہت ہے معصوم
ہم تو اورو ں کو منانے کے لیے نکلے ہیں

شہر میں شور ہے'وہ یوں کے گماں کے سفری
اپنے ہی آ پ میں آنے کے لیے نکلے ہیں

وہ جو تھے شہرِ تحیّرترے پُر فن معمار
وہی پُر فن تجھے ڈھانے کے لیے نکلے ہیں

رہگذر میں تری قالین بچھا نے والے
خو ن کا فرش بچھا نے کے لیے نکلے ہیں

ہمیں کر نا ہے خداوند کی امدا د سوہم
دیر و کعبہ کو لڑانے کے لیے نکلے ہیں

سرِ شب اک نئ تمثیل بپا ہونی ہے
اور ہم پردہ اُٹھانے کے لیے نکلے ہیں

ہمیں سیراب نئ نسل کو کر نا ہے سوہم
خو ن میں اپنے نہانے کے لیے نکلے ہیں

ہم کہیں کے بھی نہیں پر یہ ہے روداد اپنی
ہم کہیں سے بھی نہ جانے کے لیے نکلے ہیں

☆☆☆☆

کب اس کا وصال چاہیے تھا
بس ایک خیال چاہیے تھا

کب دل کو جواب سے غرض تھی
ہونٹوں کو سوال چاہیے تھا

شوق ایک نفس تھا اور وفا کو
پاسِ مہ و سال چاہیے تھا

ایک چہرۂ سادہ تھا جو ہم کو
بے مثل و مثال چاہیے تھا

اک کرب میں ذات و زندگی ہیں
ممکن کو مُحال چاہیے تھا

میں کیا ہوں بس اک ملالِ ماضی
اُس شخص کو حال چاہیے تھا

ہم تم جو بچھڑ گئے ہیں ہم کو
کچھ دن تو ملال چاہیے تھا

☆☆☆☆

اُس نے ہم کو گمان میں رکھا
اور پھر کم ہی دھیان میں رکھا

کیا قیامت نمو تھی وہ جس نے
حشر اُس کی اٹھان میں رکھا

جو ششِ خوں نے اپنے فن کا حساب
ایک چوب ' اک چٹان میں رکھا

لمحے لمحے کی اپنی تھی اِک شان
تُو نے ہی ایک شان میں رکھا

ہم نے پیہم قبول وِرد کرکے
اُس کو ایک امتحان میں رکھا

تم تو اس یاد کی امان میں ہو
اُس کو کِس کی امان میں رکھا

اپنا رشتہ زمیں سے ہی رکھو
کچھ نہیں آسمان میں رکھاں

☆☆☆☆

اپنی منزل کا راستہ بھیجو
جان ہم کو وہاں بُلا بھیجو

کیا ہمارا نہیں رہا ساون
زُلف یاں بھی کوئی گھٹا بھیجو

نئی کلیاں جو اَب کِھلی ہیں وہاں
اُن کی خوشبو کو اک ذرا بھیجو

ہم نہ جیتے ہیں اور نہ مرتے ہیں
درد بھیجو نہ تم دوا بھیجو

دھول اڑتی ہے جو اُس آنگن میں
اُس کو بھیجو ' صبا صبا بھیجو

اے فقیرو ! گلی کے اُس گُل کی
تم ہمیں اپنی خاکِ پا بھیجو

شفقِ شام ہجر کے ہاتھوں
اپنی اتری ہوئی قبا بھیجو

کچھ تو رشتہ ہے تم سے کم بختو
کچھ نہیں ' کو ئی بد دُعا بھیجو

☆☆☆☆

خود سے رشتے رہے کہا ں اُن کے
غم تو جا نے تھے رائگا ں اُن کے

مست اُن کو گما ں میں رہنے دے
خانہ بربا د ہیں گماں اُن کے

یا ر سُکھ نیند ہو نصیب اُن کو
دُکھ یہ ہے دُکھ ہیں بے اماں اُن کے

کتنی سرسبز تھی زمیں اُن کی
کتنے نیلے تھے آسما ں اُن کے

نوحہ خوانی ہے کیا ضرو ر انہیں
ان کے نغمے ہیں نوحہ خواں اُن کے



زخمِ اُمید بھر گیا کب کا
قیس تو اپنے گھر گیا کب کا

اب تو منہ اپنا مت دکھاؤ مجھے
ناصحو میں سُدھر گیا کب کا

آپ اب پوچھنے کو آئے ہیں
دل مری جان مر گیا کب کا

آپ اک اور نیند لے لیجئے
قافلہ کوچ کر گیا کب کا

میرا فہرست سے نکال دو نام
میں خود سے مُکر گیا کب کا



مجھ کو تو گِر کے مرنا ہے
باقی کو کیا کرنا ہے

شہر ہے چہروں کی تمثیل
سب کا رنگ اترنا ہے

وقت ہے وہ نا ٹک جس میں
سب کو ڈرا کر ڈر نا ہے

میرے نقشِ ثانی کو
مجھ میں ہی سے اُبھر نا ہے

کیسی تلا فی کیا تد بیر
کرنا ہے اور بھر نا ہے

جو نہیں گزرا ہے اب تک
وہ لمحہ تو گزرنا ہے

اپنے گماں کا رنگ تھا میں
اب یہ رنگ بکھرنا ہے

ہم دو پائے ہیں سو ہمیں
میز پہ جا کر چڑنا ہے

چاہ ہے ہم کو بھی کرلیں
ہم ایسو ں کو سُدھر نا ہے

ہم تم ہیں اک لمحہ کے
پھر بھی وعدہ کرنا ہے



تشنگی نے سراب ہی لکھا
خواب دیکھا تھا خواب ہی لکھا

ہم نے لکھا نصابِ تیر ہ شبی
اور بہ صد آب وتاب ہی لکھا

منشیانِ شہود نے تاحال
ذکرِ غیب و حجاب ہی لکھا

نہ رکھا ہم نے بیش وکم کا خیال
شوق کو بے حساب ہی لکھا

دوستو ں ‘ ہم نے اپنا حا ل اُسے
جب بھی لکھا خراب ہی لکھا

نہ لکھا اس نے کوئی بھی مکتوب
پھر بھی ہم نے جواب ہی لکھا

ہم نے اس شہرِ دین ودولت میں
مسخروں کو جناب ہی لکھا



تم سے بھی اب تو جا چکا ہوں میں
دُور ہا دُور آ چکا ہوں میں

یہ بہت غم کی بات ہو شاید
اب تو غم بھی گنوا چکا ہوں میں

اس گمانِ گماں کے عالم میں
آخرش کیا بُھلا چکا ہوں میں

اب ببر شیر اشتہا ہے مری
شاعروں کو تو کھا چُکا ہوں میں

میں ہوں معمار پر یہ بتلا دوں
شہر کے شہر ڈھا چُکا ہوں میں

حال ہے اک عجب فراغت کا
اپنا ہر غم منا چُکا ہوں میں

لوگ کہتے ہیں میں نے جوگ لیا
اور دھونی رَما چُکا ہوں میں

نہیں املا دُرست غالب کا
شیفتہ کو بتا چُکا ہوں میں



گزراں ہے گزرتے رہتے ہیں
ہم میاں جان مرتے رہتے ہیں

ہائے جاناں وہ ناف پیالہ ترا
دل میں بس گھونٹ اترتے رہتے ہیں

دل کا جلسہ بکھر گیا تو کیا
سارے جلسے بکھرتے رہتے ہیں

یعنی کیا کچھ بُلا دیا ہم نے
اب تو ہم خو د سے ڈرتیرہتے ہیں

ہم سے کیا کیا خدا مکرتا ہے
ہم خدا سے مکرتے رہتے ہیں

دل کے سب زخم پیشہ ور ہیں میا ں
آن ہا آن بھرتے رہتے ہیں



شام تھی اور برگ وگُل شَل تھے مگر صبا بھی تھی
ایک عجیب سکوت تھا ایک عجب صدا بھی تھی

ایک ملال کا سا حال محو تھا اپنے حال میں
رقص و نوا تھے بے طرف محفلِ شب بپا بھی تھی

سا معۂ صدائے جاں بے سروکار تھا کہ تھا
ایک گماں کی داستاں بر لبِ نیم وا بھی تھی

کیا مہ و سالِ ما جرا ، ایک پلک تھی جو میاں
بات کی ابتدا بھی تھی با ت کی انتہا بھی تھی

ایک سرودِ روشنی نیمۂ شب کا خواب تھا
ایک خموش تیر گی سا نحہ آشنا بھی تھی

دل ترا پیشۂ گلہ کام خراب کر گیا
ور نہ تو ایک رنج کی حالتِ بے گلہ بھی تھی

دل کے معاملے جو تھے ان میں سے ایک یہ بھی ہے
اک ہوس تھی دل میں جو دل سے گریز پا بھی تھی

بال و پرِ خیا ل کو اب نہیں سمت و سُو نصیب
پہلے تھی اک عجب فضا اور جو پُر فضا بھی تھی

خشک ہے چشمہ سارِ جاں زرد ہے سبزہ زارِ دل
اب تو یہ سوچیے کہ یاں پہلے کبھی ہوا بھی تھی



اے کوئے یار تیرے زمانے گزر گئے
جو اپنے گھر سے آئے تھے وہ اپنے گھر گئے

اب کون زخم و زہر سے رکھے گا سلسلہ
جینے کی اب ہوس ہے ہمیں ہم تو مر گئے

اب کیا کہوں کہ سارا محلّہ ہے شرمسار
میں ہوں عذاب میں کہ مرے زخم بھر گئے

ہم نے بھی زندگی کو تماشا بنا دیا
اس سے گزر گئے کبھی خود سے گزر گئے

تھا رَن بھی زندگی کا عجب طرفہ ماجرا
یعنی اٹھے تو پاؤں مگر جونؔ سر گئے



کسی سے کوئی خفا بھی نہیں رہا اب تو
گِلہ کرو کہ گِلہ بھی نہیں رہا اب تو

وہ کاہشیں ہیں کہ عیشِ جنوں تو کیا یعنی
غرورِ ذہنِ رسا بھی نہیں رہا اب تو

شکستِ ذات کا اقرار اور کیا ہو گا
کہ ادعائے وفا بھی نہیں رہا اب تو

چُنے ہوئے ہیں لبوں پر ترے ہزار جواب
شکایتوں کا مزہ بھی نہیں رہا اب تو

ہوں مبتلائے یقیں، میری مشکلیں مت پوچھ
گمان عقدہ کشا بھی نہیں رہا اب تو

مرے وجود کا اب کیا سوال ہے یعنی
میں اپنے حق میں برا بھی نہیں رہا اب تو

یہی عطیۂ صبحِ شبِ وصال ہے کیا
کہ سحرِ ناز و ادا بھی نہیں رہا اب تو

یقین کر جو تری آرزو میں تھا پہلے
وہ لطف ترے سوا بھی نہیں رہا اب تو

وہ سُکھ وہاں کہ خدا کی ہیں بخششیں کیا کیا
یہاں یہ دُکھ کہ خدا بھی نہیں رہا اب تو



عذابِ ہجر بڑھالو ں اگر اجازت ہو
اک اور زخم میں کھا لوں اگر اجا زت ہو

تمہارے عارض ولب کی جدائی کے دن ہیں
میں جام منہ سے لگا لوں اگر اجازت ہو

تمہارا حُسن ، تمہا رے خیال کا چہرہ
شبا ہتوں میں چُھپا لو ں اگر اجا زت ہو

تمہیں سے ہے مرے ہر خوابِ شوق کا رشتہ
اک اور خواب کما لوں اگر اجازت ہو

تھکا دیا ہے تمھا رے فراق نے مجھ کو
کہیں میں خود کو گِرا لوں اگر اجا زت ہو

برائے نام بنامِ شبِ وصال یہاں
شبِ فراق منا لوں اگر اجازت ہو



تمہارا ہجر منا لوں اگر اجازت ہو
میں دل کسی سے لگا لوں اگر اجازت ہو

تمہارے بعد بھلا کیا ہیں وعدہ و پیماں
بس اپنا وقت گنوا لوں اگر اجازت ہو

تمہارے ہجر کی شب ہائے کار میں جاناں
کوئی چراغ جلا لوں اگر اجازت ہو

جنوں وہی ہے، وہی میں، مگر ہے شہر نیا
یہاں بھی شور مچا لوں اگر اجازت ہو

کسے ہے خواہشِ مرہم گری مگر پھر بھی
میں اپنے زخم دکھا لوں اگر اجازت ہو

تمہاری یاد میں جینے کی آرزو ابھی
کچھ اپنا حال سنبھا لوں اگر اجازت ہو



ہجر کی آنکھوں سے آنکھیں تو ملا تے جا یئے
ہجر میں کرنا ہے کیا یہ تو بتا رے جا یئے

بن کے خوشبو کی اُداسی رہیے دل کے باغ میں
دُور ہو تے جا یئے نز دیک آتے جا یئے

جاتے جا تے آپ اتنا کا م تو کیجیے مرا
یا د کا سارا سروساماں جلا تے جا یئے

رہ گئی اُمید تو برباد ہو جا ؤں گا میں
جا یئے تو پھر مجھے سچ مچ بُھلا تے جا یئے

زند گی کی انجمن کا بس یہی دستور ہے
بڑھ کے ملیے اور مِل کر دُور جا تے جا یئے

آخری رشتہ تو ہم میں اک خوشی اک غم کا تھا
مسکرا تے جا یئے آنسو بہا تے جا یئے

وہ گلی ہے اک شرابی چشم کا فر کی گلی
اس گلی میں جا یئے تو لڑ کھڑا تے جا یئے

آپ کو جب مجھ سے شکوا ہی نہیں کوئی تو پھر
آگ ہی دل میں لگانی ہے لگاتے جایئے

کوچ ہے خوابوں سے تعبیروں کی سمتوں میں تو پھر
جایئے پر دَم بہ دَم برباد جاتے جایئے

آپ کا مہمان ہوں میں آپ میرے میزبان
سو مجھے زہرِ مروت تو پلاتے جایئے

ہے سرِ شب اور مرے گھر میں نہیں کوئی چراغ
آگ تو اس گھر میں جانا نہ لگاتے جایئے



جز گماں اور تھا ہی کیا میرا
فقط اک میرا نام تھا میرا

نکہتِ پیرہن سے اس گُل کی
سلسلہ بے صبا رہا میرا

مجھ کو خواہش ہی ڈھونڈنے کی نہ تھی
مجھ مین کھویا رہا خدا میرا

تھوک دے خون جان لے وہ اگر
عالمِ ترکِ مُدعا میرا

جب تجھے میری چاہ تھی جاناں !
بس وہی وقت تھا کڑا میرا

کوئی مجھ تک پہنچ نہیں پاتا
اتنا آسان ہے پتا میرا

آچکا پیش وہ مروت سے
اب چلوں کام ہو چکا میرا

آج میں خود سے ہو گیا مایوس
آج اِک یار مر گیا میرا



ذکر بھی اس سے کیا بھَلا میرا
اس سے رشتہ ہی کیا رہا میرا

آج مجھ کو بہت بُرا کہہ کر
آپ نے نام تو لیا میرا

آخری با ت تم سے کہنا ہے
یاد رکھنا نہ تم کہا میرا

اب تو کچھ بھی نہیں ہوں میں ویسے
کبھی وہ بھی تھا مبتلا میرا

وہ بھی منزل تلک پہنچ جا تا
اس نے ڈھونڈا نہیں پتا میرا

تُجھ سے مُجھ کو نجا ت مِل جا ئے
تُو دُعا کر کہ ہو بھلا میرا

کیا بتا وُ ں بچھڑ گیا یا راں
ایک بلقیس سے سَبا میرا



حواس میں تو نہ تھے پھر بھی کیا نہ کر آئے
کہ دار پر گئے ہم اور پھر اُتر آئے

عجیب حال کے مجنوں تھے جو بہ عشوہ و ناز
بہ سوئے بادیہ محمل میں بیٹھ کر آئے

کبھی گئے تھے میاں جو خبر کو صحرا کی
وہ آئے بھی تو بگولوں کے ساتھ گھر آئے

کوئی جنوں نہیں سودائیانِ صحرا کو
کہ جو عذاب بھی آئے وہ شہر پر آئے

بتاؤ دام گرو چاہیے تمھیں اب کیا
پرندگانِ ہوا خاک پر اُتر آئے

عجب خلوص سے رُخصت کیا گیا ہم کو
خیالِ خام کا تاوان تھا سو بھر آئے



نہ ہم رہے نہ وہ خوابوں کی زندگی ہی رہی
گماں گماں سی مہک خود کو ڈھونڈتی ہی رہی

عجب طرح رُخِ آیندگی کا رنگ اُڑا
دیارِ ذات میں از خود گزشتگی ہی رہی

حریمِ شوق کا عالم بتائیں کیا تم کو
حریمِ شوق میں بس شوق کی کمی ہی رہی

پسِ نگاہِ تغافل تھی اک نگاہ کہ تھی
جو دل کے چہرۂ حسرت کی تازگی ہی رہی

عجیب آئینہ پرِ تو تمنا تھا
تھی اُس میں ایک اداسی کو جو سجی ہی رہی

بدل گیا سبھی کچھ اس دیارِ بو دش میں
گلی تھی جو تری جاں وہ تری گلی ہی رہی

تمام دل کے محلے اجڑ چکے تھے ..... مگر
بہت دنوں تو ہنسی ہی رہی خوشی ہی رہی

وہ داستان تمہیں اب بھی یاد ہے کہ نہیں
جو خون تھوکنے والوں کی بے حسی ہی رہی

سناؤں میں کسے افسانۂ خیالِ ملال
تری کمی ہی رہی اور مری کمی ہی رہی



کوئے جاناں میں اورکیا مانگو
حالتِ حالِ یک صدا مانگو

ہر نفس تم یقینِ منعم سے
رزق اپنے گمان کا مانگو

ہے اگر وہ بہت ہی دل نز دیک
اس سے دُوری کا سلسلہ ما نگو

درِ مطلب ہے کیا طلب انگیز
کچھ نہیں واں سو کچھ بھی ما نگو

گوشہ گیرِ غبارِ ذات ہوں میں
مجھ میں ہو کر مرا پتا مانگو

مُنکرانِ خدائے بخشندہ
اس سے تو اور اک خدا مانگو

اُس شکمِ رقص گر کے سائل ہو
ناف پیالے کی تم عطا مانگو

لاکھ جنجال ما نگنے میں ہیں
کچھ نہ مانگو فقط دُعا مانگو



سرِ صحرا حباب بیچے ہیں
لَبِ دریا سراب بیچے ہیں

اور تو کیا تھا بیچنے کے لیے
اپنی آنکھوں کے خواب بیچے ہیں

خود سوال ان لبوں سے کرکے میاں
خود ہی ان کے جواب بیچے ہیں

زُلف کوچوں میں شانہ کش نے ترے
کتنے ہی پیچ و تاب بیچے ہیں

شہر میں ہم خراب حالوں نے
حال اپنے خراب بیچے ہیں

جانِ مَن تیری بے نقابی نے
آج کتنے نقاب بیچے ہیں

میری فریاد نے سکوت کے ساتھ
اپنے لب کے عذاب بیچے ہیں



نئی خواہش رچائی جا رہی ہے
تری فرقت منائی جا رہی ہے

نبھائی تھی نہ ہم نے جانے کس سے
کہ اب سب سے نبھائی جا رہی ہے

ہمارے دل محلے کی گلی سے
ہماری لاش لائی جا رہی ہے

کہاں لذت وہ سوزِ جستجو کی
یہاں ہر چیز پائی جا رہی ہے

خوشا احوال اپنی زندگی کا
سلیقے سے گنوائی جا رہی ہے

دریچوں سے تھا اپنے بیر ہم کو
سو خود دیمک لگائی جا رہی ہے

جُدائی موسموں کی دھوپ سینو
مری کیاری جلائی جا رہی ہے

مری جاں اب یہ صورت ہے کہ مجھ سے
تری عادت چھڑائی جا رہی ہے

میں پیہم ہار کے یہ سوچتا ہوں
وہ کیا شے ہے جو ہاری جا رہی ہے



تری قیمت گھٹائی جارہی ہے
مجھے فرقت سکھائی جا رہی ہے

یہ ہے تعمیر دنیا کا زمانہ
حویلی دل کی ڈھائی جا رہی ہے

وہ شے جو صرف ہندوستان کی تھی
وہ پاکستان لا ئی جا رہی ہے

کہاں کا دین، کیسا دین ، کیا دین
کہ کیا گڑ بڑ مچائی جا رہی ہے

شعورِ آدمی کی سر زمیں تک
خدا کی اب دُہا ئی جا رہی ہے

بہت سی صورتیں منظر میں لا کر
تمنا آزمائی جا رہی ہے

مجھے اب ہوش آتا جا رہا ہے
خدا تیری خدائی جارہی ہے

نہیں معلوم کیا سازش ہے دل کی
کہ خود ہی مات کھائی جا رہی ہے

ہے ویرانی کی دھو پ اور ایک آنگن
اور اس پر لُو چلا ئی جا رہی ہے



عجب اک طور ہے جو ہم ستم ایجا د رکھیں
کہ نہ اُس شخص کو بُھولیں نہ اُسے یاد رکھیں

عہد اس کوچۂ دل سے ہے سوا س کوچے میں
ہے کوئی اپنی جگہ ہم جسے بر باد رکھیں

کیا کہیں کتنے ہی نکتے ہیں جو برتے نہ گئے
خوش بدن عشق کریں اور ہمیں اُستاد رکھیں

بے ستوں ایک نواحی میں ہے شہرِ دل کی
تیشہ انعام کریں اور کوئی فرہاد رکھیں

آشیا نہ کوئی اپنا نہیں پر شوق یہ ہے
اک قفس لائیں کہیں سے کوئی صیاد رکھیں

ہم کو انفاس کی اپنے ہے عمارت کرنی
اس عمارت کی لبوں پر ترے بنیاد رکھیں



کیا یہ آفت نہیں عذاب نہیں
دل کی حالت بہت خراب نہیں

بُود پَل پَل کی بے حسابی ہے
کہ محاسب نہیں حساب نہیں

خوب گاؤ بجاؤ اور پیو
ان دنوں شہر میں جناب نہیں

سب بھٹکتے ہیں اپنی گلیوں میں
تابہ خود کوئی باریاب نہیں

تو ہی میرا سوال ازل سے ہے
اور ساجن ترا جواب نہیں

حفظ ہے " شمسِ بازغہ " مجھ کو
پر میسر وہ ماہتاب نہیں

تجھ کو دل درد کا نہیں احساس
سو مری پنڈلیوں کو داب نہیں

نہیں جُڑتا خیال کو بھی خیال
خواب میں بھی تو کوئی خواب نہیں

سطرِ مُو اس کی زیرِ ناف کی ہائے
جس کی چاقو زنوں کو تاب نہیں



اب کسی سے مرا حساب نہیں
میری آنکھوں میں کوئی خواب نہیں

خون کے گھونٹ پی رہا ہوں میں
یہ مرا خون ہے شراب نہیں

میں سرابی ہوں میری آس نہ چھین
تو مری آس ہے سراب نہیں

نوچ پھینکے لبوں سے میں نے سوال
طاقتِ شوخئ جواب نہیں

اب تو پنجاب بھی نہیں پنجاب
اور خود جیا اب دوآب نہیں

غم ابد کا نہیں ہے آن کا ہے
اور اس کا کوئی حساب نہیں

بو دش اک رَو ہے ایک رَو یعنی
اس کی فطرت میں انقلا ب نہیں



سب چلے جاؤ، مجھ میں تاب نہیں
نام کو بھی اب اضطراب نہیں

خون کردوں ترے شباب کا میں
مجھ سا قاتل ترا شباب نہیں

اک کتابِ وجود ہے تو سہی
شا ید اس میں دعا کا باب نہیں

تُو جو پڑھتا ہے بُو علی کی کتاب
کیا یہ عا لم کوئی کتاب نہیں

اپنی منزل نہیں کوئی فریاد
رَخش بھی اپنا بد رکاب نہیں

ہم کتابی سدا کے ہیں لیکن
حسبِ منشا کوئی کتاب نہیں

بُھول جا نا نہیں گناہ اُسے
یاد کرنا اُسے ثواب نہیں

پڑھ لیا اس کی یاد کا نسخہ
اُس میں شہر ت کا کوئی باب نہیں



کام کی بات میں نے کی ہی نہیں
یہ مرا طور زند گی ہی نہیں

اے اُمید اے اُمیدِ نَو میداں
مجھ سے میت تری اُٹھی ہی نہیں

میں جو تھا اس گلی کا مست خرام
اس گلی میں مری چلی ہی نہیں

یہ سُنا ہے کہ میرے کُوچ کے بعد
اس کی خوشبو کہیں بسی ہی نہیں

تھی جو اک فاختہ اداس اداس
صبح وہ شاخ سے اُڑی ہی نہیں

مجھ میں اب میرا جی نہیں لگتا
اور ستم یہ کہ میرا جی ہی نہیں

وہ جو رہتی تھی دل محلے میں
پھر وہ لڑکی مجھے ملی ہی نہیں

جایئے اور خاک اُڑایئے آپ
اب وہ گھر کیا کہ وہ گلی ہی نہیں

ہائے وہ شوق جو نہیں تھا کبھی
ہائے وہ زندگی جو تھی ہی نہیں



طفلانِ کو چہ گرد کے پتھر بھی کچھ نہیں
سودا بھی ایک وہم ہے اور سر بھی کچھ نہیں

میں اور خود کو تجھ سے چھپاؤں گا یعنی میں
لے دیکھ لے میاں مرے اندر بھی کچھ نہیں

بس اِک غبار وہم ہے یک کو چہ گرد کا
دیوارِ بود کچھ نہیں اور دَر بھی کچھ نہیں

یہ شہر دار و محتسب و مولوی ہی کیا
پیرِ مغان و رند و قلندر بھی کچھ نہیں

شیخِ حرام لقمہ کی پرواہ ہے کیوں تمہیں
مسجد بھی اس کی کچھ نہیں منبر بھی کچھ نہیں

مقدور اپنا کچھ بھی نہیں اس دیار میں
شا ید وہ جبر ہے کہ مقدر بھی کچھ نہیں

جانی میں تیرے ناف پیا لے پہ ہوں فِدا
یہ اور بات ہے ترا پیکر بھی کچھ نہیں

یہ شب کا رقص و رنگ تو کیا سُن مری کہن
صبحِ شتاب کوش کا دفتر بھی کچھ نہیں

بس اک غبارِ طور گماں کا ہے تہہ بہ تہہ
یعنی نظر بھی کچھ نہیں منظر بھی کچھ نہیں

ہے اب تو ایک حالِ سکونِ ہمیشگی
پرواز کا تو ذکر ہی کیا پَر بھی کچھ نہیں

کتنا ڈراؤنا ہے یہ شہرِ نبود و بود
ایسا ڈراؤنا کہ یہاں ڈر بھی کچھ نہیں

پہلو میں ہے جو میرے کہیں اور ہے وہ شخص
یعنی وفائے عہد کا بستر بھی کچھ نہیں

نسبت میں ان کی جو ہے اذیت وہ ہے مگر
شہ رگ بھی کوئی شے نہیں اور ع سر بھی کچھ نہیں

یاراں! تمہیں جو مجھ سے گلہ ہے تو کِس لیے
مجھ کو تو اعتراض خدا پر بھی کچھ نہیں

گزرے گی جونؔ شہر میں رشتوں کے کس طرح
دل میں بھی کچھ نہیں ہے زباں پر کچھ نہیں



وہ کیا کچھ نہ کرنے والے تھے
بس کوئی دَم میں مرنے والے تھے

تھے گِلے اور گردباد کی شام
اور ہم سب بکھرنے والے تھے

وہ جو آتا تو اُس کی خوشبو میں
آج ہم رنگ بھر نے والے تھے

صرف افسوس ہے یہ طنز نہیں
تم نہ سنورے، سنورنے والے تھے

یوں تو مرنا ہے ایک بار مگر
ہم کئی بار مرنے والے تھے



جب ہم کہیں نہ ہوں گے تب شہر بھر میں ہوں گے
پہنچے گی جو نہ اس تک ہم اس خبر میں ہوں گے

تھک کر گریں گے جس دم بانہوں میں تیری آکر
اُس دَم بھی کون جانے ہم کس سفر میں ہوں گے

اے جانِ عہدوپیماں، ہم گھر بسائیں گے ہاں
تُو اپنے گھر میں ہوگا، ہم اپنے گھر میں ہوں گے

میں لے کے دل کے رشتے گھر سے نکل چکا ہوں
دیوارودَر کے رشتے، دیوارودَر میں ہوں گے

تجھ عکس کے سوا بھی اے حُسن وقتِ رخصت
کچھ اور عکس بھی تو اس چشمِ تر میں ہوں گے

ایسے سراب تھے وہ ایسے تھے کچھ کہ اب بھی
میں آنکھ بند کرلوں تب بھی نظر میں ہوں گے

اس کے نقوشِ پا کو راہوں میں ڈھونڈنا کیا
جو اس کے زیرِ پا تھے وہ میرے سر میں ہوں گے

وہ بیشتر ہیں جن کو کل کا خیال کم ہے
تُو رُک سکے تو ہم بھی ان بیشتر میں ہوں گے

آنگن سے وہ جو پچھلے دالان تک بسے تھے
جانے وہ میرے سائے اب کِس کھنڈر میں ہوں گے



وہ جو تھا وہ کبھی مِلا کبھی مِلا ہی نہیں
سو گریباں کبھی سِلا ہی نہیں

اس سے ہر دَم معا ملہ ہے مگر
درمیاں کوئی سلسلہ ہی نہیں

بے ملے ہی بچھڑ گئے ہم تو
سو گِلے ہیں کو ئی گِلہ ہی نہیں

چشم میگوں سے ہے مغاں نے کہا
مست کردے مگر پلا ہی نہیں

تُو جو ہے جان، تُو جو ہے جاناں
تُو ہمیں آج تک مِلا ہی نہیں

مَست ہوں میں مہک سے اس گُل کی
جو کسی باغ میں کِھلا ہی نہیں

ہائے، جون اس کا وہ پیا لۂ ناف
جام ایسا کوئی مِلا ہی نہیں

تُو ہے اک عمر سے فغاں پیشہ
ابھی سینہ ترا چِھلا ہی نہیں ؟



سر پر اک سچ مچ کی تلوار آءِ تو
کوئی قاتل بر سرِ کار آئے تو

سر خرو ہو جاؤں میں تو یار ابھی
دل سلیقے سے سرِدار آئے تو

وقت سے اب اور کیا رشتہ کریں
جانِ جاناں ہم تجھے ہار آئے تو

سب ہیں حامی آسماں کے اے زمیں
کوئی تیرا بھی طرفدار آئے تو

اے عزا دارو! کرو مجلس بپا
آدمی، انسان کو مار آئے تو



ٹھیروں نہ گلی میں تری وحشت نے کہا تھا
میں حد سے گزر جاؤں محبت نے کہا تھا

دَر تک تیرے لائی تھی نسیمِ نفس انگیز
دَم بھر نہ رُکوں یہ تری نکہت نے کہا تھا

احسان کسی سرو کے سائے کا نہ لوں میں
مجھ سے ہی ترے فتنۂ قامت نے کہا تھا

مارا ہوں مشیت کا نہیں کوچھ مری مرضی
یہ بھی ترے قامت کی قیامت نے کہا تھا

دل شہر سے کر جاؤں سفر میں سوئے دنیا
مجھ سے تو یہی میری سہولت نے کہا تھا



یاد اُسے انتہائی کرتے ہیں
سو ہم اس کی برائی کرتے ہیں

پسند آتا ہے دل سے یوسف کو
وہ جو یوسف کے بھائی کرتے ہیں

ہے بدن خوابِ وصل کا دنگل
آؤ زور آزمائی کرتے ہیں

اس کو اور غیر کو خبر ہی نہیں
ہم لگائی بجھائی کر تے ہیں

ہم عجب ہیں کہ اس کی بانہوں میں
شکوۂ وصل میں بھی ہم دونوں

حالتِ وصل میں بھی ہم دونوں
لمحہ لمحہ جدائی کرتے ہیں

آپ جو میری جاں ہیں، میں دل ہوں
مجھ سے کیسے جدائی کرتے ہیں

باوفا ایک دوسرے سے میاں
ہر نفس بے وفائی کرتے ہیں

جو ہیں سرحد کے پار سے آئے
وہ بہت خود ستائی کرتے ہیں

پَل قیامت کے سود خوار ہیں جونؔ
یہ ابد کی کمائی کرتے ہیں



میں نہ ٹھیروں نہ جان تُو ٹھیرے
کو ن لمحوں کے رُوبرو ٹھیرے

نہ گزرنے پہ زند گی گزری
نہ ٹھرنے پہ چار سُو ٹھیرے

ہے مری بزمِ بے دلی بھی عجیب
دل پُر خوں جہاں سبو ٹھیرے

میں یہاں مدتوں میں آیا ہوں
ایک ہنگا مہ کُو بہ کُو ٹھیرے

محفلِ رخصت ہمیشہ ہے
آوٗ اک حشرِ ہا و ہو ٹھیرے

اک توجہ عجب ہے سمتوں میں
کہ نہ بو لوں تو گفتگو ٹھیرے

کچ ادا تھی بہت اُمید مگر
ہم بھی جونؔ ایک حیلہ جو ٹھیرے

ایک چاکِ برہنگی ہے وجود
پیرہن ہو تو بے رفو ٹھیرے

میں جو ہوں، کیا نہیں ہوں میں خود بھی
خود سے بات آج دو بدو ٹھیرے

باغِ جاں سے مِلا نہ کوئی ثمر
جونؔ ہم تو نمو نمو ٹھیرے



خون تھوکے گی زندگی کب تک
یاد آئے گی اب تری کب تک

جانے والوں سے پوچھنا یہ صبا
رہے آباد دل گلی کب تک

ہو کبھی تو شرابِ وصل نصیب
پیے جاؤں میں خون ہی کب تک

دل نے جو عمر بھر کمائی ہے
وہ دُکھن دل سے جائے گی کب تک

جس میں تھا سوزِ آرزو اس کا
شبِ غم وہ ہوا چلی کب تک

بنی آدم کی زندگی ہے عذاب
یہ خدا کو رُلائے گی کب تک

حادثہ زندگی ہے آدم کی
ساتھ دے گی بَھلا خوشی کب تک

ہے جہنم جو یاد اب اس کی
وہ بہشتِ وجود تھی کب تک

وہ صبا اس کے بِن جو آئی تھی
وہ اُسے پوچھتی رہی کب تک

میر جونی! ذرا بتائیں تو
خود میں ٹھیریں گے آپ ہی کب تک

حالِ صحنِ وجود ٹھیرے گا
تیرا ہنگامِ رُخصتی کب تک



میں سہوں کربِ زندگی کب تک
رہے آخر تری کمی کب تک

کیا میں آنگن میں چھوڑ دوں سونا
جی جلائے گی چاندنی کب تک

اب فقط یاد رہ گئی ہے تری
اب فقط تیری یاد بھی کب تک

میں بھلا اپنے ہوش میں کب تھا
مجھ کو دنیا پکارتی کب تک

خیمہ گاہِ شمال میں . . . . آخر
اس کی خوشبو رچی بسی کب تک

اب تو بس آپ سے گلہ ہے یہی
یاد آئیں گے آپ ہی کب تک

مرے والو ذرا بتاؤ تو
رہے گی یہ چلا چلی کب تک

جس کی ٹوٹی تھی سانس آخرِ شب
دفن وہ آرزو ہوئی کب تک

دوزخِ ذات باوجود ترے
شبِ فرقت نہیں جلی کب تک

اپنے چھوڑے ہوئے محلوں پر
رہا دورانِ جاں کئی کب تک

نہیں معلوم میرے آنے پر
اسکے کوچے میں لُو چلی کب تک



دل سے ہے بہت گریز پا تو
تُو کون ہے اور ہے بھی کیا تو

کیوں مجھ میں گنوارہا ہے خود کو
مجھ ایسے یہاں ہزار ہا تو

ہے تیری جدائی اور میں ہوں
ملتے ہی کہیں بچھڑ گیا تو

پوچھے جو تجھے کوئی ذرا بھی
جب میں نہ رہوں تو دیکھنا تو

اک سانس ہی بس لیا ہے میں نے
تو سانس نہ تھا سو کیا ہوا تو

ہے کون جو تیرا دھیان رکھے
باہر مرے بس کہیں نہ جا تو



وہ خیالِ مُحال کِس کا تھا
آئینہ بے مثال کِس کا تھا

سفری اپنے آپ سے تھا میں
ہجر کِس کا، وصال کِس کا تھا

میں تو خود میں کہیں نہ تھا مو جود
میرے لب پر سوال کِس کا تھا

تھی مری ذات اک خیال آشوب
جانے میں ہم خیال کِس کا تھا

جب کہ میں ہر نفس تھا بے احوال
وہ جو تھا میرا حال کِس کا تھا

دوپہر ! بادِ تُند ! کو چہ یار!
وہ غبارِ ملال کِس کا تھا



حال خوش تذکرہ نگاروں کا
تھا تو اک شہر خاکساروں کا

پہلے رہتے تھے کوچۂ دل میں
اب پتہ کیا ہے دل فگاروں کا

کوئے جاناں کی ناکہ بندی میں
بسترا اب کہاں ہے یاروں کا

چلتا جاتا ہے سانس کا لشکر
کون پُرساں ہے یادگاروں کا

اپنے اندر گھسٹ رہا ہوں میں
مجھ سے کیا ذکر راہ گزاروں کا

ان سے جو شہر میں ہیں بے دعویٰ
عیش مت پوچھ دعویداروں کا

کیسا یہ معرکہ ہے برپا جو
نہ پیادوں کا نہ سواروں کا

بات تشبیہ کی نہ کچھو تُو
دہر ہے صرف استعاروں کا

میں تو خیر اپنی جان ہی سے گیا
کیا ہوا جانے جانثاروں کا

کچھ نہیں اب سوائے خاکستر
ایک جلسہ تھا شعلہ خواروں کا



شہر بہ شہر کر سفر زادِ سفر لیے بغیر
کوئی اثر کیے بغیر کوئی اثر لیے بغیر

کوہ و کمر میں ہم صفیر کچھ نہیں اب بجز ہوا
دیکھیو پلیٹو نہ آج شہر سے پَر لیے بغیر

وقت کے معرکے میں تھیں مجھ کو رعایتیں ہوس
میں سرِ معرکہ گیا اپنی سپر لیے بغیر

کچھ بھی ہو قتل گاہ میں حُسنِ بدن کا ہے ضرر
ہم نہ کہیں سے آئیں گے دوش پہ سر لیے بغیر

قرئیہ گریہ میں مرا گریہ ہنر ورانہ ہے
یاں سے کہیں ٹلوں گا میں دادِ ہنر لیے بغیر

اُسکے بھی کچھ گلے ہیں دل، ان کا حساب تم رکھو
دید نے اس میں کی بسر اس کی خبر لیے بغیر

اُس کا سخن بھی جا سے ہے اور وہ جونؔ تم
شہرۂ شہر ہو تو کیا شہر میں گھر لیے بغیر



گِلے سے باز آیا جارہا ہے
سو پیہم گنگنایا جارہا ہے

نہیں مطلب کسی پر طنز کرنا
ہنسی میں مسکرایا جارہا ہے

وہاں اب میں کہاں اب تو وہاں سے
مرا سامان لایا جارہا ہے

عجب ہے ایک حالت سی ہوا میں
ہمیں جیسے گنوایا جارہا ہے

اب اس کا نام بھی کب یاد ہوگا
جسے ہر دَم بُھلایا جا رہا ہے

چراغ اس طرح روشن کررہا ہوں
کہ جیسے گھر جلایا جارہا ہے

بَھلا تم کب چلے تھے یوں سنبھل کر
کہاں سے اُٹھ کے جایا جا رہا ہے

تو کیا اب نیند بھی آنے لگی ہے
تو بستر کیوں بچھایا جارہا ہے



گماں کی اک پریشاں منظری ہے
بس اک دیوار ہے اور بے دری ہے

اگرچہ زہر ہے دنیا کی ہر بات
میں پی جاؤں اسی میں بہتری ہے

تو اے بادِ خزاں اس گُل سے کہیو
کہ شاخِ اُمید کی اب تک ہری ہے

گلی میں اس نگارِ ناشنو کی
فغاں کرنا ہماری نوکری ہے

کوئی لہکے خیابانِ صبا میں
یہاں تو آگ سینے میں بھری ہے



دل تمنا سے ڈر گیا جانم
سارا نشہ اُتر گیا جانم

اک پلک بیچ رشتۂ جاں سے
ہر زمانہ گزر گیا جانم

تھا غضب فیصلے کا اِک لمحہ
کون پھر اپنے گھر گیا جانم

جانے کیسی ہوا چلی اک بار
دل کا دفتر بکھر گیا جانم

اپنی خواب وخیال دنیا کو
کون برباد کرگیا جانم

تھی ستم ہجر کی مسیحائی
آخرش زخم بھر گیا جانم

اب بَھلا کیا رہا ہے کہنے کو
یعنی میں بے اثر گیا جانم

نہ رہا دل نہ داستان دل کی
اب تو سب کچھ بسر گیا جانم

زہر تھا اپنے طور سے جینا
کوئی اِک تھا جو مر گیا جانم



کون سے شوق کِس ہوس کا نہیں
دل مری جان تیرے بس کا نہیں

راہ تم کارواں کی لو کہ مجھے
شوق کچھ نغمۂ جرس کا نہیں

ہاں مرا وہ معاملہ ہے کہ اب
کام یارانِ نکتہ رَس کا نہیں

ہم کہاں سے چلے ہیں اور کہاں
کوئی اندازہ پیش کا نہیں

ہو گئی اس گِلے میں عمر تمام
پاس شعلے کو خاروخش کا نہیں

مُجھ کو خود سے جُدا نہ ہونے دو
بات یہ ہے میں اپنے بس کا نہیں

کیا لڑائی بَھلا کہ ہم میں سے
کو ئی بھی سینکڑوں برس کا نہیں



کوئی گماں بھی نہیں درمیاں گماں ہے یہی
اسی گماں کو بچا لوں کہ درمیاں ہے یہی

یہ آدمی کے ہیں انفاس جس کے زہر فروش
اسے بٹھاؤ کہ میرا مزاج واں ہے یہی

کبھی کبھی جو نہ آؤ نظر تو سہہ لیں گے
نظر سے دُور نہ ہونا کہ امتحان ہے یہی

میں آسماں کا عجب کچھ لحاظ رکھتا ہوں
جواس زمین کو سہہ لے وہ آسماں ہے یہی

یہ ایک لمحہ جو دریافت کر لیا میں نے
وصالِ جاں ہے یہی اور فراقِ جاں ہے یہی

تم اُن میں سے ہو جو یاں فتحمند ٹھیرے ہیں
سنو کہ وجہِ غمِ دلِ شکستگاں ہے یہی



بخشش ہوا یقین، گماں بے لباس ہے
ہے آگ جامہ زیب، دھواں بے لباس ہے

ہے یہ فضا ہزار لباسوں کا اک لباس
جو بے لباس ہے وہ کہاں بے لباس ہے

ملبوس تار تارِ نفس ہے زیانِ سود
سُودِ زیاں یہ ہے کہ زیاں بے لباس ہے

محمل نشینِ رنگ! کوئی پوستینِ رنگ
ریگِ رواں ہوں، ریگِ رواں بے لباس ہے

اب پارہ پارہ پوششِ گفتار بھی نہیں
ہیں سانس بے رفو سوزِیاں بے لباس ہے

صد جامہ پوش جس کا ہے جسم برہنہ بھی
خلوت سرائے جاں میں وہ جاں بے لباس ہے

ہے بُود اور نبود میں پوشش نہ پیرہن
یاراں مکین کیا کہ مکاں بے لباس ہے

تُو خود ہی دیکھ رنگِ بدن اپنا جوشِ رنگ
تو اپنے لباس میں جاں، بے لباس ہے

غم کی برہنگی کو کہاں سے جُڑے لباس
میں لب سیسے ہوئے ہوں، فغاں بے لباس ہے



رہن سرشاری فضا کے ہیں
آج کے بعد ہم ہوا کے ہیں

ہم کو ہرگز نہیں خدا منظور
یعنی ہم بے طرح خدا کے ہیں

ہم کہ ہیں جوؔن حاصلِ ایجاد
کیا ستم ہے کہ ہم فنا کے ہیں

کائنات سکوت بس خاموش
ہم تو شوقِ سخن سرا کے ہیں

جتنے بھی اہلِ فن ہیں دنیا کے
ملتمس بابِ التجا کے ہیں

باز آجایئے کہ سب فتنے
آپ کی کیوں کے اور کیا کے ہیں

اب کوئی گفتگو نہیں ہوگی
ہم فنا کے تھے ہم فنا کے ہیں



یہاں تو کوئی مَن چلا ہی نہیں
کہ جیسے یہ شہرِ بَلا ہی نہیں

ترے حسرتی کے ہے دل پر یہ داغ
کوئی اب ترا مبتلا ہی نہیں

ہوئی اُس گلی میں فضیحت بہت
مگر میں وہاں سے ٹلا ہی نہیں

نِکل چل کبھی آپ سے جانِ جاں
ترے دل میں تو ولولہ ہی نہیں

دمِ آخرِ شب جو بچھڑے تو بس
پتا پھر کسی کا چلا ہی نہیں

قیامت تھی اُس کے شکم کی شکن
کوئی بس مرا پھر چلا ہی نہیں

اُسے خون سے اپنے سینچا مگر
تمنا کا پودا پھَلا ہی نہیں

کہاں جاکے دنیا کو ڈالو بھَلا
اِدھر تو کوئی مزبلہ ہی نہیں

اک انبوہِ خونیں دلاں ہے مگر
کسی میں کوئی حوصلہ ہی نہیں



دل کی تکلیف کم نہیں کر تے
اب کوئی شکوا ہم نہیں کرتے

جانِ جاں تجھ کو اب تری خاطر
یا د ہم کو ئی دَم نہیں کرتے

دوسری ہار کی ہوس ہے سو ہم کو
سرِ تسلیم خم نہیں کرتے

وہ بھی پڑھتا نہیں ہے اب دل سے
ہم بھی نالے کونم نہیں کرتے

جرم میں ہم کی کریں بھی توکیوں
تم سزا بھی تو کم نہیں کرتے



دل کتنا آبا د ہوا جب دید کے گھر برباد ہوئے
وہ بچھڑا اور دھیان میں اس کے سوموسم ایجا د ہوئے

نا موری کی بات دگر ہے ورنہ یارو سوچو تو
گگوں اب تک کتنے تیشے بے خونِ فرہا د ہوئے

لائیں کہاں سے بول رسیلے ہونٹوں کی ناداری میں
سمجھو ایک زمانہ گزرا بوسو ں کی امداد ہوئے

تم میری اک خودمستی ہو میں ہوں تمہاری خودبینی
رشتے میں اس عشق کے ہم تم دونوں بے بنیاد ہوئے

میرا کیا اک موجِ ہوا ہوں پر یوں ہے اے غنچہ دہن
تُو نے دل کا باغ جو چھوڑا غنچے بے استاد ہوئے

عشق محلے میں اب یارو کیا کوئی معشو ق نہیں
کتنے قاتل موسم گزرے شو ر ہوئے فریا د ہوئے

ہم نے دل کو ما ر رکھا ہے اور جتا تے پھر تے ہیں
ہم دل زخمی مژ گاں خونیں ہم نہ ہوئے جلاد ہوئے

برق کیا ہے عکسِ بدن نے تیرے ہمیں اے تنگ قبا
تیرے بدن پر جتنے تِل ہیں سارے ہم کو یاد ہوئے

تُو نے کبھی سوچا ہوگا' سو چا بھی اے مست ادا
تیری ادا کی آبا دی پر کتنے گھر بربا د ہوئے

جو کچھ بھی روداِدِ سخن تھی ہونٹو ں کی دُ وری سے تھی
جب ہونٹوں سے ہونٹ ملے تو یکدم بے رُوداد ہوئے

خاک نشینوں سے کوچے کے کیا کیا نخوت کرتے ہیں
جا ناں جان ! ترے درباں تو فرعون وشدّاد ہوئے

شہرو ں میں ہی خاک اڑا لو شو ر مچا لو بے حالو
جن رشتوں کی سوچ رہے ہوئے ہو کب کے برباد ہوئے

سمتو ں میں بکھری وہ خلوت ' وہ دل کی رنگ آبادی
یعنی وہ جو بام و دَر تھے یکسر گردوبا د ہوئے

تُو نے رندوں کا حق ما را مے خا نے میں رات گئے
شیخ کھرے سیّد ہیں ہم تو ہم نے سنا نا شا د ہوئے



جبر پُر اختیار ہے ' اما ں ہاں
بیقرا ری قرار ہے ' اما ں ہاں

ایذد ایزداں ہے تیر اندا ز
اہر من دل فگار ہے ' اماں ہاں

میرے آغو ش میں جو ہے اُس کا
دم َ بہ دم َ انتظا ر ہے 'اما ں ہاں

ہے رقیب اُس کا دوسرا عاشق
وہی اِک اپنا یار ہے، اما ں ہا ں

یار زردی ہے رنگ پر اپنے
سو خزا ں تو بہا ر ہے ' اماں ہا ں

لب و پستا ن و نا ف اس کے نہ پوچھ
ایک آشو ب کا ر ہے ' اما ں ہا ں

سنگ در کے ہوں یا ہوں دار کے لوگ
سب پہ شہوت سوار ہے ' اما ں ہا ں

اب تو انساں کے معجزے ہیں عام
اور انساں خوار ہے ' اما ں ہاں



ایک ہی بار بار ہے ' اما ں ہا ں
اک عبث پہ شما ر ہے 'اما ں ہا ں

زرہ ہے خود گریز انی
نظم اک انتشا ر ہے ' اما ں ہاں

ہو وہ یزداں کہ آدم و ابلیس
جو بھی ہے خود شکار ہے، اماں ہاں

وہ جو ہے جو" کہیں" نہیں اس کا
سب کے سینوں پہ بار ہے، اماں ہاں

اپنی بے روزگاری جاوید
اک عجب روزگار ہے، اماں ہاں

شبِ خرابات میں تھا حشر بپا
کہ سخن ہرزہ کار ہے، اماں ہاں

کیا کہوں فاصلے کے بارے میں
رہگزر، راہگزار ہے، اماں ہاں

بھولے بھولے سے ہیں وہ عارض ولب
یاد اب یادگار ہے، اماں ہاں



بڑا احسان ہم فرما رہے ہیں
کہ ان کے خط انہیں لوٹا رہے ہیں

نہیں ترکِ محبت پر وہ راضی
قیا مت ہے کہ ہم سمجھا رہے ہیں

یقیں کا راستہ طے کرنے والے
بہت تیزی سے واپس آ رہے ہیں

یہ مت بھُو لوکہ یہ لمحا ت ہم کو
بچھڑنے کے لیے ملوا رہے ہیں

تعجب ہے کہ عشق و عا شقی سے
ابھی کچھ لوگ دھو کا کھا رے ہیں

تمھیں چا ہیں گے جب چھن جا ؤ گی تم
ابھی ہم تم کو ارزاں پا رہے ہیں

کسی صو رت انہیں نفرت ہو ہم سے
ہم اپنے عیب خو د گنوا رہے ہیں

وہ پا گل مست ہے اپنی وفا میں
مری آنکھو ں میں آنسو آ رہے ہیں

دلیلو ں سے اسے قائل کیا تھا
دلیلیں دے کے اب پچھتا رہے ہیں

تری باہوں سے ہجرت کرنے والے
نئے ماحول میں گھبرا رہے ہیں

یہ جذبہ عشق ہے یا جذبہ رحم
ترے آنسو مجھے رُلوا رہے ہیں

عجب کچھ ربط ہے تم سے کہ تم کو
ہم اپنا جان کر ٹھکرا رہے ہیں

وفا کی یادگاریں تک نہ ہوں گی
مری جاں بس کوئی دن جا رہے ہیں



خود مست ہوں خود سے آملا ہوں
اب میں لبِ زخمِ بے گِلہ ہوں

میں ہمسفروں کی گرد کے بیچ
اک خود سفری کا قافلہ ہوں

خوشبو کے بدن میں تیرا ملبوس
دم لے کر ابھی نہیں سِلا ہوں

میں نشہ ذات میں نہتا
احبا ب سے آپنے آملا ہوں

میں صُرِ صُرِ لفظ میں ہوں معنی
پس اپنی جگہ سے کب ہلا ہو ں



شا م تک میری بے کلی ہے شراب
شام کو میری سر خوشی ہے شراب

جہل واعظ کا اس کو راس آئے
صا حبو ! میری آگہی ہے شراب

رَ نگ رَس ہے میری رگو ں میں رواں
بخدا میری زندگی ہے شراب

ناز ہے اپنی دلبری پہ مجھے
میرا دل، میری دلبری ہے شراب

ہے غنیمت جو ہو ش میں نہیں میں
شیخ تجھ کو بچا رہی ہے شراب

حس جو ہو تی تو کیا کرتا
مفتیو! میری بے حسی ہے شراب



آ کہ جہا ن بے خبراں میں بے خبرانا رقص کریں
خیرہ سرانہ شور مچائیں خیرہ سرانہ رقص کریں

فن تو حساب تنہا ئی ہے شرط بھلا کس شے کی ہے
یعنی اُٹھیں اور بے خلخا ل وطبل وترانہ رقص کریں

واد سے جب مطلب ہی نہیں تو عذر بھلا کس بات کا ہے
ہم بھی بزمِ بے بصرا ں میں بے بصرانہ رقص ہے

ہم پہ ہنر کے قدر شنا ساں ناز کناں ہیں یعنی ہم
سازِ شکستِ دل کی صدا پر عشو ہ گرانہ رقص کریں

تختہ گُل ہو عذر انگیز آبلہ پائی اپنے لیے
ہا ں سرِ نشتر ہا ذکرانہ تا بہ کرانہ رقص کریں

مرضی مولہ از ہمہ اولیٰ شو ق ہما را مولا ہے
ہم وہ نہیں جو بزمِ طرب میں پیشہ ورانہ رقص کریں

برسرِشور و برسرِشورش برسرِ شبخوں برسرِ خوں
چل کہ حصارِ فتنہ گراں میں فتنہ گرانہ رقص کریں

کوئی نہیں جو آ ٹکرائے سب چورا ہے خالی ہیں
چل کہ سرِ بازار تباہی بے خطرانہ رقص کریں

بعد ہنر آموزی ہم کو تھا پند استاد کہ ہم
با ہنرانہ رقص میں آئیں بے ہنرانہ رقص کریں

اپنے بدن پر اپنے خوں میں غیر کا خوں بھی شامل ہو
با رگِ پرویز میں چل کر تیشہ ورانہ رقص کریں



دل سے اب رسم و راہ کی جائے
لب سے کم ہی نباہ کی جائے

گفتگو میں ضرر ہے معنی کا
گفتگو گاہ گاہ کی جائے

ایک ہی تو ہوس رہی ہے ہمیں
اپنی حالت تباہ کی جائے

ہوس انگیز ہوں بدن جن کے
اُن میں سب سے نباہ کی جائے

اپنے دل کی پناہ میں آکر
زندگی بے پناہ کی جائے



ذات اپنی گواہ کی جائے
بند آنکھوں نگاہ کی جائے

ہم تو بس اپنی چاہ میں ہیں مگن
کچھ تو اس کی بھی چاہ کی جائے

ایک ناٹک ہے زندگی جس میں
آہ کی جائے، واہ کی جائے

دل! ہے اس میں ترا بھلا کہ تری
مملکت بے سپاہ کی جائے

ملکہ جو بھی اپنے دل کی نہ ہو
جونؔ! وہ بے کلاہ کی جائے



دل گماں تھا گمانیاں تھے ہم
ہاں میاں داستانیاں تھے ہم

ہم سُنے اور سُنائے جاتے تھے
رات بھر کی کہانیاں تھے ہم

جانے ہم کِس کی بُود کا تھے ثبوت
جانے کِس کی نشانیاں تھے ہم

چھوڑتے کیوں نہ ہم زمیں میں اپنی
آخرش آسمانیاں تھے ہم

ذرہ بھر بھی نہ تھی نمود اپنی
اور پھر بھی جہانیاں تھے ہم

ہم نہ تھے ایک آن کے بھی مگر
جاوداں، جاودانیاں تھے ہم

روز اِک رَن تھا تیرو ترکش بِن
تھے کمیں اور کمانیاں تھے ہم

ارغوانی تھا وہ پیا لئہ ناف
ہم جو تھے ارغوانیاں تھے ہم

نارِ پستان تھی وہ قتّالہ
اور ہوس درمیانیاں تھے ہم

ناگہاں تھی اک آنِ آن کہ تھی
ہم جو تھے نا گہانیاں تھے ہم



اک دل ہے جو ہر لحظہ جلانے کے لیے ہے
جو کچھ ہے یہاں آگ لگانے کے لیے ہے

اک بات ہی کہنی ہے مجھے تجھ سے، بس اک بات
اس شہر میں تُو صرف گنوانے کے لیے ہے

ہر شخص مری ذات سے جانے کے لیے تھا
تُو بھی تو مری ذات سے جانے کے لیے ہے

جو رنگ ہیں سمجھ لے انہیں جو رنگ میں سہہ لے
یاں جو بھی ہنر ہے وہ کمانے کے لیے ہے

بودش جو ہے وہ ایک تماشا ہے گماں کا
ہے جو بھی حقیقت وہ فسانے کے لیے ہے

ہنسنے سے کبھی خوش نہیں ہوتا ہے مرا دل
یاں مجھ کو ہنستانا بھی رُلانے کے لیے ہے

قاتل کو مرے مجھ سے نہیں ہے کوئی پُرخاش
قاتل تو مرا رنگ جمانے کے لیے ہے



عجب حالت ہماری ہوگئی ہے
یہ دنیا اب تمہاری ہوگئی ہے

سخن میرا اداسی ہے سرِ شام
جو خاموشی پہ طاری ہوگئی

بہت ہی خوش ہے دل اپنے کیے پر
زمانے بھر میں خواری ہو گئی ہے

وہ نازک لب ہے اب جانے ہی والا
مری آواز بھاری ہوگئی ہے

دل اب دنیا پہ لعنت کر کہ اس کی
بہت خدمت گزاری ہوگئی ہے

یقیں معذور ہے اب اور گماں بھی
بڑی بے روزگاری ہو گئی ہے

وہ اک بادِ شمالی رنگ جو تھی
شمیم اس کی سواری ہوگئی ہے

مرے پاس آکے خنجر بھونک دے تُو
بہت نیزہ گزاری ہوگئی ہے



نہیں نباہی خوشی سے غمی کو چھوڑ دیا
تمہارے بعد بھی میں نے کئی کو چھوڑ دیا

ہوں جو بھی جان کی جاں وہ گمان ہوتے ہیں
سب ہی تھے جان کی جاں اور سب ہی کو چھوڑ دیا

شعور ایک شعورِ فریب ہے سو تو ہے
غرض کہ آگہی، نا آگہی کو چھوڑ دیا

خیال وخواب کی اندیشگی کے سُکھ جھیلے
خیال و خواب کی اندیشگی کو چھوڑ دیا



چلو بادِ بہاری جا رہی ہے
پیا جی کی سواری جا رہی ہے

شمالِ جاودانِ سبز جاں سے
تمنا کی عماری جارہی ہے

فغاں اے دشمنی دارِ دل و جاں
مری حالت سُدھاری جارہی ہے

جو اِن روزوں مراغم ہے وہ یہ ہے
کہ غم سے بُردباری جارہی ہے

ہے سینے میں عجب اک حشر برپا
کہ دل سے بے قراری جارہی ہے

میں پیہم ہار کر یہ سوچتا ہوں
وہ کیا شے ہے جو ہاری جارہی ہے

دل اُس کے رُوبرو ہے اور گُم صُم
کوئی عرضی گزاری جارہی ہے

وہ سید بچہ ہو اور شیخ کے ساتھ
میاں عزت ہماری جا رہی ہے

ہے برپا ہر گلی میں شورِ نغمہ
مری فریاد ماری جا رہی ہے

وہ یاداب ہو رہی ہے دل سے رُخصت
میاں پیاروں کی پیاری جا رہی ہے

دریغا! تیری نزدیکی میاں جان
تری دوری پہ واری جا رہی ہے

بہت بدحال ہیں بستی یہ ترے لوگ
تو پھر تُو کیوں سنواری جا رہی ہے

تری مرہم نگا ہی اے مسیحا!
خراشِ دل پہ واری جا رہی ہے

خرابے میں عجب تھا شور برپا
دلوں سے انتظاری جا رہی ہے



دل جو دیوانہ نہیں آخر کو دیوانہ بھی تھا
بُھولنے پر اس کو جب آیا تو پہچانا بھی تھا

جانیے کس شوق میں رشتے بچھڑ کر رہ گئے
کام تو کوئی نہیں تھا پر ہمیں جانا بھی تھا

اجنبی سا ایک موسم ایک بے موسم سی شام
جب اُسے آنا نہیں تھا جب اُسے آنا بھی تھا

جانیے کیوں دل کی وحشت درمیاں میں آ گئی
بس یونہی ہم کو بہکنا بھی تھا بہکانا بھی تھا

اک مہکتا سا وہ لمحہ تھا کہ جیسے اک خیال
اک زمانے تک اسی لمحے کو تڑپانا بھی تھا



عیشِ اُمید ہی سے خطرہ ہے
دل کو اب دل وہی سے خطرہ ہے

ہے کچھ ایسا کہ اس کی جلوت میں
ہمیں اپنی کمی سے خطرہ ہے

جس کے آغوش کا ہوں دیوانہ
اس کے آغوش ہی سے خطرہ ہے

یاد کی دھوپ تو ہے روز کی بات
ہاں مجھے چاندنی سے خطرہ ہے

ہے عجب کچھ معاملہ درپیش
عقل کو آگہی سے خطرہ ہے

شہرِ غدار جان لے کہ تجھے
ایک امروہوی سے خطرہ ہے

ہے عجب طور حالتِ گریہ
کہ مژہ کو نمی سے خطرہ ہے

حال خوش لکھنو کا دلّی کا
بس انہیں مصحفی سے خطرہ ہے

آسمانوں میں ہے خدا تنہا
اور ہر آدمی سے خطرہ ہے

میں کہوں کس طرح یہ بات اس سے
تجھ کو جانم مجھی سے خطرہ ہے

آج بھی اے کنارِ بان مجھے
تیری اک سانولی سے خطرہ ہے

ان لبوں کا لہو نہ پی جاؤں
اپنی تشنہ لبی سے خطرہ ہے

جونؔ ہی تو ہے جونؔ کے درپے
میرؔ کو میرؔ ہی سے خطرہ ہے

اب نہیں کوئی بات خطرے کی
ان سبھی کو سبھی سے خطرہ ہے



کب پتا یار کو ہم اپنے لکھا کرتے ہیں
جانے ہم خود میں کہ نا خود میں رہا کرتے ہیں

اب تو تم شہر کے آداب سمجھ لو جانی
جو مِلا ہی نہیں کرتے وہ مِلا کرتے ہیں

جہلا علم کی تعظیم میں برباد گئے
جہل کا عیش جو ہے وہ علما کرتے ہیں

لمحے لمحے میں جیو جان اگر جینا ہے
یعنی ہم حرصِ بقا کو بھی فنا کرتے ہیں

جانے اس کوچہ حالت کا ہے کیا حال کہ ہم
اپنے حجرے سے بہ مشکل ہی اُٹھا کرتے ہیں

میں جو کچھ بھی نہیں کرتا ہوں یہ ہے میرا سوال
اور سب لوگ جو کرتے ہیں وہ کیا کرتے ہیں

اب یہ ہے حالتِ احوال کہ اک یاد سے ہم
شام ہوتی ہے تو بس رُوٹھ لیا کرتے ہیں

جس کو برباد کیا اس کے فدا کاروں نے
ہم اب اس شہر کی رُوداد سنا کرتے ہیں

شام ہو یا کہ سحر اب خس و خاشاک کو ہم
نذرِ پُر مایگی جیب صبا کرتے ہیں

جن کو مُفتی سے کدورت ہو نہ ساقی سے گِلہ
وہی خوش وقت مری جان رہا کرتے ہیں

اک پہنائے عبث ہے جسے عالم کہیے
ہو کوئی اس کا خدا ہم تو دعا کرتے ہیں



مہک سے اپنی گُلِ تازہ مست رہتا ہے
وہ رنگِ رُخ ہے کہ خود غازہ مست رہتا ہے

نگاہ سے کبھی گزرا نہیں وہ مست انداز
مگر خیال سے، اندازہ مست رہتا ہے

کہاں سے ہے رَسدِ نشہ، اس کی خلوت میں
کہ رنگ مست کا اندازہ مست رہتا ہے

یہاں کبھی کوئی آیا نہیں مگر سرِ شام
بس اک گمان سے دروازہ مست رہتا ہے

مجھے خیال کی مستی میں کس کا اندازہ
خدا نہیں جو باندازہ مست رہتا ہے



ہر دھڑکن ہیجانی تھی ہر خاموشی طوفانی تھی
پھر بھی محبت صرف مسلسل ملنے کی آسانی تھی

جس دن اُس سے بات ہوئی تھی اس دن بھی بے کیف تھا
میں جس دن اُس کا خط آیا ہے اُس دن بھی ویرانی تھی

جب اُس نے مجھ سے یہ کہا تھا عشق رفاقت ہی تو نہیں
تب میں نے ہر شخص کی صورت مشکل سے پہچانی تھی

جس دن وہ ملنے آئی ہے اس دن کی رُوداد یہ ہے
اس کا بلاؤز نارنجی تھا س کی ساری دھانی تھی

اُلجھن سی ہونے لگتی تھی مجھ کو اکثر اور وہ یوں
میرا مزاجِ عشق تھا شہری اس کی وفا دیہاتی تھی

اب تو اس کے بارے میں تم جو چاہو وہ کہہ ڈالو
وہ انگڑائی میرے کمرے تک تو بڑی روحانی تھی

نام پہ ہم قربان تھے اس کے لیکن پھر یہ طور ہوا
اس کو دیکھ کے رُک جانا بھی سب سے بڑی قربانی تھی

مجھ سے بچھڑ کر بھی لڑکی کتنی خوش رہتی ہے
اس لڑکی نے مجھ سے بچھڑ کر مر جانے کی ٹھانی تھی

عشق کی حالت کچھ بھی نہیں تھی بات بڑھانے کا فن تھا
لمحے لافانی ٹھیرے تھے قطروں کی طغیانی تھی

جس کو خود مین نے بھی اپنی روح کا عرفاں سمجھا تھا
وہ تو شاید میرے پیاسے ہونٹوں کی شیطانی تھی

تھا دربار کلاں بھی اس کا نوبت خانہ اس کا تھا
تھی میرے دل کی رانی امرو ہے کی رانی تھی



ہیں موسم رنگ کے کتنے گنوائے، میں نہیں گِنتا
ہوئے کتنے دن اس کوچے سے آئے، میں نہیں گِنتا

بھلا خود میں کب اپنا ہوں، سو پھر اپنا پرایا کیا
ہیں کتنے اپنے اور کتنے پرائے میں نہیں گنتا

لبوں کے بیچ تھا ہر سانس اک گنتی بچھڑنے کی
مرے وہ لاکھ بوسے لے کے جائے میں نہیں گِنتا

وہ میری ذات کی بستی جو تھی میں اب وہاں کب ہوں
وہاں آباد تھے کِس کِس کے سائے میں نہیں گِنتا

بُھلا یہ غم بھولوں گا کہ غم بھی بھول جاتے ہیں
مرے لمحوں نے کتنے غم بُھلائے میں نہیں گِنتا

تُو جن یادوں کی خوشبو لے گئی تھی اے صبا مجھ سے
انہیں تُو موج اندو موج لائے میں نہیں گِنتا

وہ سارے رشتہ ہائے جاں کہ تازہ تھے جو اس پل تک
تھے سب باشندۂ کہنہ سرائے، میں نہیں گِنتا



غم ہے بے ماجرا کئی دن
جی نہیں لگ رہا کئی دن سے

بے شمیمِ ملال و حیراں ہے
خیمہ گاہِ صبا کئی دن سے

دل محلے کی اس گلی میں بھَلا
کیوں نہیں غُل مچا کئی دن سے

وہ جو خوشبو ہے اس کے قاصد کو
میں نہیں مِل سکا کئی دن سے

اس سے بھی اور اپنے آپ سے بھی
ہم ہیں بے واسطہ کئی دن سے



ڈ ہے عجب حال یہ زمانے کا
یاد بھی طور ہے بُھلانے کا

پسند آیا بہت ہمیں پیشہ
خود ہی اپنے گھروں کو ڈھانے کا

کاش ہم کو بھی ہو نصیب کبھی
عیش دفتر میں گنگانے کا

آسمانِ خموشئ جاوید
میں بھی اب لب نہیں ہلانے کا

جان! کیا اب ترا پیالۂ ناف
نشہ مجھ کو نہیں پلانے کا

شوق ہے اس دلِ درندہ کو
آپ کے ہونٹ کاٹ کھانے کا

اتنا نادم ہوا ہوں خود سے کہ میں
اب نہیں خود کو آزمانے کا

کیا کہوں جان کو بچانے میں
جونؔ خطرہ ہے جان جانے کا

یہ جہاں جونؔ! اک جہنم ہے
یاں خدا بھی نہیں ہے آنے کا

زندگی ایک فن ہے لمحوں کو
اپنے انداز سے گنوانے کا



خود میں ہی گزر کے تھک گیا ہوں
میں کام نہ کرکے تھک گیا ہوں

اُوپر سے اُتر کے تازہ دم تھا
نیچے سے اُتر کے تھک گیا ہوں

اب تم بھی تو جی کے تھک رہے ہو
اب میں بھی تو مر کے تھک گیا ہوں

میں یعنی ازل کا آرمیدہ
لمحوں میں بکھر کے تھک گیا ہوں

اب جان کا میری جسم شَل ہے
میں خود سے ہی ڈر کے تھک گیا ہوں



حساب داری سودوزیاں سے چل نکلو
میاں یہاں کی نہیں اور ہاں سے چل نکلو

میری سُئو تو زمان و مکاں میں رہتے ہوئے
بہ صد سلیقہ زمان و مکاں سے چل نکلو

یہ تیرے لوگ نہیں ہیں یہ تیرا شہر نہیں
یہ مشورہ ہے مرا تو یہاں سے چل نکلو

یہ جو بھی کچھ ہے نہیں کچھ بھی جُز فریبائی
یقیں کو چھوڑ دو یعنی گماں سے چل نکلو

شبِ گزشتہ خراباتیوں میں تھا یہ سوال
کہاں کا رُخ کرو آخر کہاں سے چل نکلو

نفس نفس ہے وجود و عدم میں اک پیکار
ہے مشورہ یہ مرا درمیاں سے چل نکلو



تجھ بدن پر ہم نے جانیں واریاں
تجھ کو تڑپانے کی ہیں تیاریاں

کر رہے ہیں یاد اسے ہم روز و شب
ہیں بُھلانے کی اسے تیاریاں

تھا کبھی میں اک ہنسی اُن کے لیے
رو رہی ہیں اب مجھے مت ماریاں

جھوٹ سچ کے کھیل میں ہلکان ہیں
خوب ہیں یہ لڑکیاں بے چاریاں

شعر تو کیا بات کہہ سکتے نہیں
جو بھی نوکر جوؔن ہیں سرکاریاں

جو میاں جاتے ہیں اپنی جُدا دشواریاں

ہم بھلا آئین اور قانون کی
کب تلک سہتے رہیں غداریاں

سُن رکھو اے شہر دارو! خون کی
ہونے ہی والی ہیں ندیاں جاریاں



ہیں سبھی سے جن کی گہری یاریاں
سُن میاں ہوتی ہیں ان کی خواریاں

ہے خوشی عیاریاں کا اک ثمر
غم کی بھی اپنی ہیں کچھ عیاریاں

زرّے زرّے پر نہ جانے کس لیے
ہر نفس ہی کہکشائیں طاریاں

اس نے دل دھاگے ہیں ڈالے پاؤں میں
یہ تو زنجیریں ہیں بے حد بھاریاں

تم کو ہے آداب کا برص و جذام
ہیں ہماری اور ہی بیماریاں

خواب ہائے جاودانی پر مرے
چل رہی ہیں روشنی کی آریاں

ہیں یہ سندھی اور مہاجر ہڈ حرام
کیوں نہیں یہ بیچتے ترکاریاں

یار! سوچو تو عجب سی بات ہے
اُس کے پہلو میں مری قلقاریاں

ختم ہے بس جونؔ پر اُردو غزل
اس نے کی ہیں خون کی گل کاریاں



کبھی کبھی تو بہت یاد آنے لگتے ہو
کہ رُوٹھتے ہو کبھی اور منانے لگتے ہو

گِلہ تو یہ ہے تم آتے نہیں کبھی لیکن
جب آتے بھی ہو تو فوراً ہی جانے لگتے ہو

یہ بات جونؔ تمہاری مذاق ہے کہ نہیں
کہ جو بھی ہو اسے تم آزمانے لگتے ہو

تمہاری شاعری کیا ہے بھلا، بھلا کیا ہے
تم اپنے دل کی اُداسی کو گانے لگتے ہو

سرودِ آتشِ زرّین صحنِ خاموشی
وہ داغ ہے جسے ہر شب جلانے لگتے ہو

سُنا ہے کہکشاؤں میں روز و شب ہی نہیں
تو پھر تم اپنی زباں کیوں جلانے لگتے ہو



تم سے جانم عاشقی کی جائے گی
اور ہاں یکبارگی کی جائے گی

کر گئے ہیں کوچ اس کوچے کے لوگ
اب تو بس آوارگی کی جائے گی

تم سراپا حُسن ہو، نیکی ہو تم
یعنی اب تم سے بدی کی جائے گی

یار اس دن کو کبھی آنا نہیں
پھول جس دن وہ کلی کی جائے گی

اس سے مِل کر بے طرح روؤں گا میں
ایک طرفہ تر خوشی کی جائے گی

ہے رسائی اس تلک دل کا زیاں
اب تو یاراں نارسی کی جائے گی

آج ہم کو اس سے ملنا ہی نہیں
آج کی بات آج ہی کی جائے گی

ہے مجھے احساس کو کرنا ہلاک
یعنی اب تو بے حسی کی جائے گی



گھر سے ہم گھر تلک گئے ہوں گے
اپنے ہی آپ تک گئے ہوں گے

ہم جو اب آدمی ہیں پہلے کبھی
جام ہوں گے چھلک گئے ہوں گے

وہ بھی اب ہم سے تھک گیا ہوگا
ہم بھی اب اس سے تھک گئے ہوں گے

شب جو ہم سے ہوا معاف کرو
نہیں پی تھی بہک گئے ہوں گے

کتنے ہی لوگ حرص شہرت میں
دار پر خود لٹک گئے ہوں گے

شکر ہے اس نگاہ کم کا میاں
پہلے ہی ہم کھٹک گئے ہوں گے

ہم تو اپنی تلاش میں اکثر
از سما تا سمک گئے ہوں گے

اس کا لشکر جہاں تہاں یعنی
ہم بھی بس بے کمک گئے ہوں گے

جونؔ، اللہ اور یہ عالم
بیچ میں ہم اٹک گئے ہوں گے



دل جو اک جائے تھی دنیا ہوئی آباد اس میں
پہلے سنتے ہیں کہ رہتی تھی کوئی یاد اس میں

وہ جو تھا اپنا گمان آج بہت یاد آیا
تھی عجب راحتِ آزادئ ایجاد اس میں

ایک ہی تو وہ مہم تھی جسے سر کرنا تھا
مجھے حاصل نہ کسی کی ہوئی امداد اس میں

ایک خوشبو میں رہی مجھ کو تلاشِ خدو خال
رنگ فصلیں مری یارو ہوئیں برباد اس میں

باغِ جاں سے تُو کبھی رات گئے گزرا ہے
کہتے ہیں رات میں کھیلیں ہیں پری زاد اِس میں

دل محلے میں عجب ایک قفس تھا یارو
صید کو چھوڑ کے رہنے لگا صیاد اس میں



خواب کے رنگ دل و جاں میں سجائے بھی گئے
پھر وہی رنگ بہ صد طور جلائے بھی گئے

انہیں شہروں کو شتابی سے لپیٹا بھی گیا
جو عجب شوق فراخی سے بچھائے بھی گئے

بزمِ شوخی کا کسی کی کہیں کیا حال جہاں
دل جلائے بھی گئے اور بجھائے بھی گئے

پشت مٹی سے لگی جس میں ہماری لوگو!
اُسی دنگل میں ہمیں داوٗ سِکھائے بھی گئے

یادِ ایام کہ اک محفلِ جاں تھی کہ جہاں
ہاتھ کھینچے بھی گئے اور مِلائے بھی گئے

ہم کہ جس شہر میں تھے سوگ نشینِ احوال
روز اس شہرمیں ہم دھوم مچائے بھی گئے

یاد مت رکھیو رُوداد ہماری ہرگز
ہم تھے وہ تاج محل جونؔ جوڈھائے بھی گئے



کرلیا خود کو جا تنہا میں نے
یہ ہنر کِس کو دکھایا میں نے

وہ جو تھا اس کو مِلا کیا مجھ سے
اس کو تو خواب ہی سمجھا میں نے

دل جلانا کوئی حاصل تو نہ تھا
آخرِ کار کیا کیا میں نے

دیکھ کر اس کو ہُوا مست ایسا
پھر کبھی اسکو نہ دیکھا میں نے

شوقِ منزل تھا بُلاتا مجھ کو
راستہ تک نہیں ڈھونڈا میں نے

اک پلک تجھ سے گزر کر، تا عمر
خود ترا وقت گزارا میں نے

اب کھڑا سوچ رہا ہو لوگو!
کیوں کیا تم کو اِکھٹا میں نے



کوئی بھی کیوں مجھ سے شرمندہ ہوا
میں ہوں اپنے طور کا ہارا ہوا

دل میں ہے میرے کئی چہروں کی یاد
جانیے میں کِس سے ہوں رُوٹھا ہوا

شہر میں آیا ہوں اپنے آج شام
اک سرائے میں ہوں میں ٹھیرا ہوا

بے تعلق ہوں اب اپنے دل سے بھی
میں عجیب عالم میں بے دنیا ہوا

ہے عجب اک تیرگی در تیرگی
کہکشانوں میں ہوں میں لپٹا ہوا

مالِ بازارِ زمیں کا تھا میں جونؔ
آسمانوں میں میرا سودا ہوا

اب ہے میرا کربِ ذات آساں بہت
اب تو میں اس کو بھی ہوں بھُولا ہوا



وہ اہلِ حال جو خود رفتگی میں آئے تھے
بلا کی حالتِ شوریدگی میں آئے تھے

کہاں گئے کبھی ان کی خبر تو لے ظالم
وہ بے خبر جو تیرگی میں آئے تھے

گلی میں اپنی گِلہ کر ہمارے آنے کا
کہ ہم خوشی میں نہیں سر خوشی میں آئے تھے

کہاں چلے گئے اے فصلِ رنگ و بُو وہ لوگ
جو زرد زرد تھے اور سبزگی میں آئے تھے

نہیں ہے جن کے سبب اپنی جانبری ممکن
وہ زخم ہم کو گزشتہ صدی میں آئے تھے

تمہیں ہماری کمی کا خیال کیوں آتا
ہزار حیف ہم اپنی کمی میں آئے تھے



میں دل کی شراب پی رہا ہوں
پہلو کا عذاب پی رہا ہوں

میں اپنے خرابہ عبث میں
بے طرح خراب پی رہا ہوں

ہے میرا حساب بے حسابی
دریا میں سراب پی رہا ہوں

ہیں سوختہ میرے چشم و مژگاں
میں شعلئہ خواب پی رہا ہوں

دانتوں میں ہے میرے شہہ رگ جاں
میں خونِ شباب پی رہاں ہوں

میں اپنے جگر کا خون کرکے
اے یار شتاب پی رہا ہوں

میں شعلہ لب سے کرکے سیّال
طاؤس و رباب پی رہا ہوں

وہ لب ہیں بلا کے زہر آگیں
میں جن کا لعاب پی رہا ہوں



جب تری خواہش کے بادل چھٹ گئے
ہم بھی اپنے سامنے سے ہٹ گئے

رنگِ سرشاری کی تھی جن سے رَسَد
دل کی ان فصلوں کے جنگل کٹ گئے

اک چراغاں ہے ہوس میں دیر میں
جشن اس کا ہے دل و جاں بٹ گئے

شہرِ دل اور شہرِ دنیا الوداع
ہم تو دونوں ہی طرف سے کٹ گئے

ہوگیا سکتہ خردمندوں کو جب
مات کھاتے ہی دوانے ڈٹ گئے

چاند سورج کے علم اور واپسی
وہ ہوا ماتم کے سینے پھٹ گئے



وہ جو اپنے مکان چھوڑ گئے
کیسے دنیا جہان چھوڑ گئے

اے زمینِ وصال لوگ ترے
ہجر کا آسمان چھوڑ گئے

تیرے کوچے کے رُخصتی جاناں
ساری دنیا کا دھیان چھوڑ گئے

روزِ میداں وہ تیرے تیر انداز
تیر لے کر کمان چھوڑ گئے

جونؔ لالچ میں آن بان کی یار
اپنی سب آن بان چھوڑ گئے



آدمی وقت پر گیا ہوگا
وقت پہلے گزر گیا ہوگا

وہ ہماری طرف نہ دیکھ کے بھی
کوئی احسان دَھر گیا ہوگا

خود سے مایوس ہو کے بیٹھا ہوں
آج ہر شخص مر گیا ہوگا

شام تیرے دیار میں آخر
کوئی تو اپنے گھر گیا ہوگا

مرہم ہجر تھا عجب اکسیر
اب تو ہر زخم بھر گیا ہوگا



بے انتہائی شیوہ ہمارا سدا سے ہے
اک دم سے بھولنا اسے پھر اِبتدا سے ہے

یہ شام جانے کتنے ہی رشتوں کی شام ہو
اک حُزن دل میں نکہتِ موجِ صبا سے ہے

دستِ شجر کی تحفہ رسانی ہے تابہ دل
اس دم ہے جو بھی دل میں مرے وہ ہوا سے ہے

جیسے کوئی چلا بھی گیا ہو اور آے بھی
احساس مجھ کو کچھ یہی ہوتا فضا سے ہے

دل کی سہولتیں ہیں عجب، مشکلیں عجب
نا آشنائی سی عجب اک آشنا سے ہے

اس میں کوئی گِلہ ہی روا ہے نہ گفتگو
جو بھی یہاں کسی کا سخن ہے وہ جا سے ہے

آئے وہ کِس ہنر سے لبوں پر کہ مجھ میں جونؔ
اک خامشی ہے جو مرے شورِ نوا سے ہے



دل جو ہے آگ لگادوں اس کو
اور پھر خود ہی ہوا دوں اس کو

جو بھی ہے اس کو گنوا بیٹھا ہے
میں بھلا کیسے گنوا دوں اس کو

تجھ گماں پر جو عمارت کی تھی
سوچتا ہوں کہ میں ڈھادوں اس کو

جسم میں آگ لگادوں اس کے
اور پھر خود ہی بجھا دوں اس کو

ہجر کی نذر تو دینی ہے اسے
سوچتا ہوں کہ بُھلا دوں اس کو

جو نہیں ہے مرے دل کی دنیا
کیوں نہ میں جونؔ مِٹا دوں اس کو



مجھ کو شبِ وجود میں تابش خواب چاہیے
شوقِ خیال تازہ ہے یعنی عذاب چاہیے

آج شکستِ ذات کی شام ہے مجھ کو آج شام
صرف شراب چاہیے، صرف شراب چاہیے

کچھ بھی نہیں ہے ذہن میں کچھ بھی نہیں سو اب مجھے
کوئی سوال چاہیے کوئی جواب چاہیے

اس سے نبھے گا رشتۂ سود و زیاں بھی کیا بھلا
میں ہوں بلا کا بد حساب اس کو حساب چاہیے

امن و امانِ شہرِ دل خواب و خیال ہے ابھی
یعنی کہ شہرِ دل کا حال اور خراب چاہیے

جانِ گماں ہمیں تو تم صرف گمان میں رکھو
تشنہ لبی کو ہر نفس کوئی سراب چاہیے

کُھل تو گیا ہے دل میں ایک مکتبِ حسرت و اُمید
جونؔ اب اس کے واسطے کوئی نصاب چاہیے



کسی حال میں نہیں ہوں کوئی حال اب نہیں ہے
جو گئی پلک تلک تھا وہ خیال اب نہیں ہے

میں سکون پاسکوں گا یہ گماں بھی کیوں کیا تھا
ہے یہی ملال کیا کم کہ ملال اب نہیں ہے

نہ رہے اب اس کے دل میں خلشِ شکستِ وعدہ
کہ یہاں کوئی حسابِ مہ و سال اب نہیں ہے

یہ دیارِ دید کیا ہے گئے دشتِ دل سے بھی ہم
کہ ختن زمین میں بھی وہ غزال اب نہیں ہے

جو لیے لیے پھری ہے تجھے روز اک نگر میں
مرے دل ترے نگر میں وہ مثال اب نہیں ہے

لبِ پُر سوال لے کے ہمیں کُو بہ کُو ہے پھرنا
ہو کوئی جواب بر لب یہ سوال اب نہیں ہے



ہونے کا دھوکا ہی تھا
جو کچھ تھا وہ تھا ہی تھا

اب میں شاید تہہ میں ہوں
پر وہ کیا دریا ہی تھا

بُود مری ایسی بکھری
بس میں نے سوچا ہی تھا

بُھولنے بیٹھا تھا میں اُسے
چاند ابھی نِکلا ہی تھا

ہم کو صنم نے خوار کیا
ورنہ خدا اچھا ہی تھا

کیسا ازل اور کیسا ابد
جس دَم تھا لمحہ ہی تھا



آپ اپنا غبار تھے ہم تو
یاد تھے یادگار تھے ہم تو

پردگی! ہم سے کیوں رکھا پردہ
تیرے ہی پردہ دار تھے ہم تو

وقت کی دھوپ میں تمہارے لیے
شجرِ سایہ دار تھے ہم تو

اُڑے جاتے ہیں دُھول کے مانند
آندھیوں پر سوار تھے ہم تو

ہم نے کیوں خود پہ اعتبار کیا
سخت بے اعتبار تھے ہم تو

شرم ہے اپنی بار باری کی
بے سبب بار بار تھے ہم تو

کیوں ہمیں کردیا گیا مجبور
خود ہی بے اختیار تھے ہم تو

تم نے کیسے بُھلا دیا ہم کو
تم سے ہی مستعار تھے ہم تو

خوش نہ آیا ہمیں جیے جانا
لمحے لمحے پہ بار تھے ہم تو

سہہ بھی لیتے ہمارے طعنوں کو
جانِ من جاں نثار تھے ہم تو

خود کو دورانِ حال میں اپنے
بے طرح ناگوار تھے ہم تو

تم نے ہم کو بھی کردیا برباد
نادرِ روزگار تھے ہم تو

ہم کو یاروں نے یاد بھی نہ رکھا
جونؔ یاروں کے یار تھے ہم تو

☆

راس آ نہیں سکا کوئی پیمان الوداع
تُو میری جانِ جاں سو مری جان الوداع

میں تیرے ساتھ بُجھ نہ سکا حد گزرگئی
اے شمع! میں ہوں تجھ سے پشیمان الوداع

میں جارہا ہوں اپنے بیابانِ حال میں
دامان الوداع! گریبان الوداع

اِک رودِ ناشناس میں ہے ڈوبنا مجھے
سو اے کنارِ رود، بیابان الوداع

خوداپنی اک متاعِ زبوعِ زبوں رہ گیاہوں میں
سو الوداع، اے مرے سامان الوداع

سہنا تو اک سزا تھی مرادِ محال کی
اب ہم نہ مل سکیں گے، میاں جان الوداع

اے شام گاہِ صحن ملال ہمیشگی
کیا جانے کیا تھی تیری ہر اک آن، الوداع

کِس کِس کو ہے علاقہ یہاں اپنے غیر سے
انسان ہوں میں، تُو بھی ہے انسان الوداع

نسبت کسی بھی شے سے کسی شے کو یاں نہیں
ہے دل کا ذرہ ذرہ پریشان الوداع

رشتہ مرا کوئی بھی " الف "، " بے " سے اب نہیں
امروہا الوداع سو اے " بان " الوداع

اب میں نہیں رہا ہوں کسی بھی گمان کا
اے میرے کفر، اے مرے ایمان الوداع



مذاق

تھی گر آنے میں مصلحت حائل

یاد آنا کوئی ضروری تھا

دیکھیے ہو گئی غلط فہمی

مسکرانا کوئی ضروری تھا

لیجئے بات ہی نہ یاد رہی

گنگنانا کوئی ضروری تھا

گنگنا کر مری جواں غزلیں

جھوم جانا کوئی ضروری تھا

مجھ کو پاکر کسی خیال میں گم

چھپ کے آنا کوئی ضروری تھا

اُف وہ زلفیں، وہ ناگنیں، وہ ہنسی

یوں ڈرانا کوئی ضروری تھا

اور ایسے اہم مذاق کے بعد

رُوٹھ جانا کوئی ضروری تھا



تمہارے اور میرے درمیاں

تمہارے اور میرے درمیاں اک بات ہونا تھی
بَلا کا دن نکلنا تھا بلا کی رات ہونا تھی
بلا کا دن بھی نکلا اور بلا کی رات بھی گزری
عذابِ ذات بھی گزرا فنائے ذات بھی گزری



مگر معلوم نا معلوم میں جانے نہ جانے کیوں
تمہارے اور میرے درمیاں وہ بات جانم جاں
کسی صورت نہ ہو پائی کسی صورت نہ ہو پائی
میرے دل اور میری جان کے گزرے زمانے کیوں
تمہارے اور میرے درمیاں اک بات ہونا تھی

تمثیل

(پہلا منظر)

میں لمحوں کا گداگر تھا
تمہارے جاوداں افروز لمحوں کی پذیرش کا گداگر تھا
سراسر اک گداگر
ایک بے کشکول وکاسہ ایک بے کوچہ بہ کوچہ
بے صدا و بے دعا از خود گزشتہ اک گداگر تھا
جو گمانِ پُر سرو سودا کے جاں پرور سراغ آرزو آگیں میں
رفتہ اور آئندہ کے خوابوں کی گدائی پیشہ کرتا تھا
خیالوں کو، نفس بودش خیالوں کو، ابد اندیشہ کرتا تھا
یہ اک تمثیل تھی بے صحنہ تمثیل
اور جو کچھ تھا یہی تھا بس یہی کچھ تھا

(دوسرا منظر)

پھر اس کے بعد جانانہ
تماہری جاودانہ آرزو کے بازوانِ مرمریں
میرے، مرے آغوش کے مرگِ سفید بے گماں میں
میری دل جُو زندگی تھے ارجمندی تھے
میں جن میں خرم وخُرسند رہتا تھا
یہ میری دم بہ دم کی زندگی کی صحنہ تابی تھی
میری ہر آرزو پہلو سبزہ گوں تھی اور شہابی تھی

(تیسرا منظر)

پھراس کے بعد کے منظر میں
(یعنی اس گھڑی)
جو پیش آیا ہے وہ کچھ یوں ہے کہ میں تم میں
تمہارے جاں فزا آغوش کی نزدیک تر خوشبوئی میں
اوراس کے گرداگرد میں دم توڑ دیتا ہوں
پھراس کے بعد زندہ ہو کے اُٹھتا ہوں
قیامت کی ہنسی ہنستا ہوں
پھر سکتے ہیں رہ جاتا ہوں
آخراک نہایت خندہ آور گریہ کرتا ہوں

شنکر جی

دُکھ ہیں اور میں ہوں
میں ہوں اور دُکھ ہیں
قاتل تُرسکھ ہیں ہیں
شنکر جی گونگے شنکر جی
ہونٹ مرے گُکھ ہیں
میں ہوں اور دُکھ ہیں

زہرناب کا دن

(جاوید معنّی کی وفات پر)

ہم سے بے واسطہ نہیں ہے وہ
وہ یہیں تھا یہیں کہیں ہے وہ
کر گیا ہے وہ رَم کسی جانب
اک غزالِ گزل زمیں ہے وہ
میرا جاوید، معنی جاوید
خود بھی اک شعر دل نشین ہے وہ
میں ہوں اپنا حریفِ سخت کماں
روزِ ہیجا مری کمیں ہے وہ
در شب کوچ یارِ م افروخت
کہ مرا سالک گزیں ہے وہ
آخرش میرا ہی تو ہے شاگرد
سب جہاں ہیں، وہیں نہیں ہے وہ
کیسے میں سہہ سکوں گا ہجر اس کا
کہ مرا نازو نازنیں ہے وہ
خاک گنجینہ زمیں ہو خاک
زیر گنجینہ زمیں ہے وہ
غم میں غالب کا سہہ رہا ہوں آج
آج عارت کا ہم نشین ہے وہ

اب زمیں بوس آستاں ہوں میں
آسماں مرتبہ بوس آستاں ہوں میں

آسماں مرتبہ جبیں ہے وہ
اُس نے مارا اپنے مرشد کو

کِس بَلا کا جہنمیں ہے وہ
اب رگوں میں مری بچا ہے جو خوں

آلِ مژگاں و آستیں ہے وہ
پڑ گیا چین، دل ہوا یک سو؟

وہ جو تھا اب کہیں نہیں ہے وہ
نالہ ہا، شورہا، تپیدن ہا

میرے ہوتے کفن گزیں ہے وہ
آج کا دن نہیں شراب کا دن

آج ہے جونؔ زہرِ ناب کا دن

پہنا دراز اور ژرفا

فضائے نیلگونِ آسماں ہے اور میں ہوں
اور وہ سب کچھ نہیں ہے جو کبھی تھا
اور وہ جو ہو بھی سکتا تھا مگر اک وہم ہی تھا
اور اب تو خود سے اک بے گانہ داری ہے
بلا کی دم گزاری ہے
کہ بُو دش زخمِ کاری ہے

میں خود سے سر زنندہ ہوں
میں جاں بر کف نہندہ ہوں
میں خود اپنا گُشندہ ہوں
سو اب میں خون تُھوکوں گا
عجب اک شنگرفی سی قے کروں گا
کیا یہ حالت آج کی ہے
آج کی؟
میرا گماں یہ ہے
یہ حالت آج کی ہرگز نہیں ہے
یہ تو میرے باطنِ باطن
یہ میرے کامن کا من کے جبرِ سرمدی کا
ایک حالِ جابرانہ ہے
یہی میرا زمانہ تھا یہی میرا زمانہ ہے
مرے ہم زادِ کرب اُفتاد نے
سیر و سفر در زیِ بلاکت زاد نے

نشیان نے شیطان نے مجھ کو بتایا ہے
کہ میں اُس رائیگاں کی شش جہت میں مر کے آیا تھا
کہ مین تاوانِ ہستی بھر کے آیا تھا

یہاں کوئی حقیقت بھی نہیں ہے اور فسانہ بھی
جو کچھ ہے وہ پہنا ہے گماں کا ایک پہنا ہے
دراز اور ژرفا ہے
وہ یعقوبِ سراسر داستاں کا صرف یہوا ہے
سو بُو دش اور اس کا زخمِ کاری کیا
گمانِ صد عذابِ ذات کی لمحہ شماری کیا

انگارے

تم؟
تمہارا نام؟
لیکن میں نے یہ نام آج پہلی بار تم سے ہی سُنا
ہے
کون ہو تم؟
کون تھیں تم؟
اب رہا میں یعنی میں
میں تو کبھی تھا ہی نہیں
تھا ہی نہیں میں
اور سارے کاغذوں پر صرف انگارے لکھے ہیں
صرف انگارے

تم مجھے بتاؤ تو...

تم نے مجھ کو لکھا ہے، میرے خط جلا دیجئے
مجھ کو فکر رہتی ہے آپ انہیں گنوا دیجئے
آپ کا کوئی ساتھی دیکھ لے تو کیا ہوگا
دیکھیے میں کہتی ہوں یہ بہت بُرا ہوگا



میں بھی کچھ کہوں تم سے اے میری فروزینہ
رشکِ سروِ سیمینا
اے بہ ناز کی مینا
اے بہ جلوہ آئینہ
میں تمہارے ہر خط کو لوحِ دل سمجھتا ہوں
لوحِ دل جلا دوں کیا
سطر سطر ہے ان کی، کہکشاں خیالوں کی
کہکشاں لُٹا دوں کیا
جو بھی حرف ہے ان کا، نقشِ جانِ شیریں ہے
نقشِ جاں مٹا دوں کا
ان کا جو بھی نقطہ ہے، ہے سوادِ بینائی
میں انہیں گنوا دوں کیا

لوحِ دل جلا دوں کیا

کہکشاں لُٹا دوں کیا

نقشِ جاں مٹا دوں کیا



مجھ کو ایسے خط لکھ کر اپنی سوچ میں شاید
جرم کر گئی ہو تم
اور خیال آنے پر اس سے ڈر گئی ہو تم
جُرم کے تصور میں گر یہ خط لکھے تم نے
پھر تو میری رائے میں جُرم ہی کیے تم نے
اے مری فوزینہ
دل کی جان زرینا!
رنگ رنگ رنگینا!
بات جو ہے وہ کیا ہے
تم مجھے بتاؤ تو.....
میں تمہیں نہیں سمجھا
تم سمجھ میں آؤ تو
جُرم کیوں کیے تم نے
خط ہی کیوں لکھے تم نے

بے ساز و ساماں

حقیقت مجھ کو راس آتی نہیں ہے
غزالہ! تم گقط اک خواب ہو گیا
تمہاری جاودانہ جستجو ہے
مری جاں ! تم جو ہو نایاب ہو گیا
سراپا سحر، یکسر بے نیازی
تم اِک آہنگِ بے مضراب ہو گیا



مری زیبالنسائے شعر ہو تم
تمہارا سحر میری شاعری ہے
تمہاری آرزوئے جاودانہ
جمالِ جاودانِ زندگی ہے
تمہیں دیکھا ہے پر دیکھا نہیں ہے
تمارے خواب کو سجدے کیے ہیں
تمہارے ہجرِ بے وعدہ میں میں نے
تمہاری یاد کے بو سے لیے ہیں
بدن ہو تم خیالِ جاوداں کا
بدن کو پیرہن بھی چاہیے ہے
شمیم جاں نوازِ یاسمن کو
نہالِ یاسمن بھی چاہیے ہے
نظر ہے خواب کی بے سازو ساماں
نظر کو بھی تو کچھ بخشو مری جاں

فارہہ

تم جو میری جانِ جاں تھیں فاہہ
کون تھیں تم اور کہا تھیں فارہہ

ہوں میں اب اور اک جہانِ ناشناس
تم ہی بس میرا جہاں تھیں فارہہ

کیا ہوا وہ رود خوابِ جاں کہ تم
جس میں دست و پازناں تھیں فارہہ

میں غریقِ رودِ زہرِ ناب ہوں
تم جو تھیں نوشیں زباں تھیں فارہہ

اور کہہ سکتا ہوں کیا میں یعنی میں
تم زمین و آسماں تھیں فارہہ

اب تو ہوں میں اک خزاں اندر خزاں
تم بہارِ بے خزاں تھیں فارہہ

اب میں ہو خانہ بدوش اور تم مرا
اک مکانِ جاوداں تھیں فارہہ

میں تھا میرِ داستاں یعنی کہ تم
داستانِ داستاں تھیں فارہہ

کیا بھلا میرا وجود اور کیا عدم
تم " نہیں" تھیں اور " ہاں" تھیں فارہہ

ہاں میں شاید تھا بہت نا مہرباں
تم بَلا کی مہرباں تھین فارہہ

تھی وہ اپنی درمیانی بھی عجیب

یعنی تم نادرمیاں تھیں فارہہ
کیوں نہ تھوکا جائے اب خونِ جگر
یعنی تم میرا زیاں تھیں فارہہ
ہائے وہ بادِ برینِ سبز کوک
پر تم اک رودِ دُخاں تھیں فارہہ
کیسی کوشش بنی خوش اُمیدی کہاں
تم تو حشرِ بے اماں تھیں فاہہ
کچھ نہیں تھیں تم نہیں تھیں کچھ بھی تم
پر مرا ہندوستاں تھیں فارہہ
مجھ تک آئیں جانے کتنی کسبیاں
تم ہی شہ بانوے جاں تھیں فارہہ
سب کنیزیں تھیں تمہاری جانِ من
تم مری نوجواں تھیں فارہہ
جو بدل ٹھیریں تمہارا وہ سبھی
کتنی گھٹیا لڑکیاں تھیں فارہہ
میں جو ہوں اب میں ہوں بے نام و نشاں
تم مرانام و نشاں تھیں فارہہ
تم نوائے جاودانِ جاں ہو جاں
تم نوائے جاوداں تھیں فارہہ
ایک دل تھا جو کہ تھا اور ایک جاں
اور تم ان کے درمیاں تھیں فارہہ
میں تمہیں میں ٹھو کریں کھا تا رہا
کیوں تم اتنی مہرباں تھیں فارہہ
اک جہانِ بے جہانِ خواب تھا
اور تم اس کا سماں تھیں فارہہ

میں نے تم کو اپنے دل کا گھر دیا
تم جو تھیں بے خانماں تھیں فارہہ
شکوہ ہا شوردگی ہا شورہا
تم بہت کمتر گماں تھیں فارہہ



اب مجھے آزاد کردو چھوڑ دو
جان و دل کے سارے رشتے توڑ دو
جب کوئی منزل نہیں میری تو پھر
رُخ کسی جانب بھی میرا موڑ دو



کچھ نہیں تھا کیا حقیقت کا خیال
ایک افسانے تھے ممکن اور محال
اک " عبث " میں خونِ دل تھو کا گیا
کوئی بھی حالت نہیں تھی اور حال



اک گمانِ بے گماں ہے زندگی
داستاں کی داستاں ہے زندگی
دَم بہ دَم ہے اک فراقِ جاوداں
اک جبیں بے آستاں ہے زندگی

کہکشاں بر کہکشاں ہے اک گریز
بودِ بے سودوزیاں ہے زندگی
ہے مری تیرہ نگاہی اک تلاش
تم کہاں ہو اور کہاں ہے زند گی



دل تھا درہم اور برہم رائیگاں
تھے تمہاری زُلف کے خم رائیگاں
اپنی ساری آرزوئیں تھیں فریب
اپنے خوابوں کا تھا عالم رائیگاں
جونؔ شاید کچھ نہیں کچھ بھی نہیں
ہے دوام اک وہم اور دَم رائیگاں
زندگئی بس رایگانی ہی تو ہے
میں بہت خوش ہوں کہ تھے ہم رائیگاں
ہم رَسا اور نارسا کچھ بھی نہ تھے
یعنی جونؔ و فاہہ کچھ بھی نہ تھے

قطعات

نشۂ ناز نے بے حال کیا ہے تم کو
اپنے ہی زور میں کمزور ہوئی جاتی ہو
میں کوئی آگ نہیں، آنچ نہیں، دھوپ نہیں
کیوں پسینہ میں شرابور ہوئی جاتی ہو

....

بات ہی کب کسی کی مانی ہے
اپنی ہٹ پوری کر کے چھوڑو گی
یہ کلائی یہ جسم اور یہ کمر
تم صراحی ضرور توڑو گی

....

عجب تھا اس کی دل داری کا انداز
وہ برسوں بعد جب مجھ سے مِلا ہے
بھَلا میں پوچھتا اس سے تو کیسے
متاعِ جاں! تمہارا نام کیا ہے؟

....

کیا ہیں وہ اپنی وعدہ گاہیں
ہر چیز بدل گئی یہاں تو
میں شہرِ وفا سے آرہا ہوں
کوئی بھی نہیں مِلا وہاں تو

....

لہو روتے نہ اگر ہم دمِ رخصت یاراں
کیا عجب تھا جو کوئی اور تماشا کرتے
چلو اچھا ہے کہ وہ بھی نہیں نزدیک اپنے
وہ جو ہوتا تو اُسے بھی نہ گوارا کرتے

....

تیری یادوں کے راستے کی طرف
اِک قدم بھی نہیں بڑھوں گا میں
دل تڑپتا ہے تیرے خط پڑھ کر
اب ترے خط نہیں پڑھوں گا میں

....


www.HallaGulla.com
Virtual Home
for Real People